فہرست

شذرات	قربانی	جاوید احمد غامدی	۲
	قربانی: سوچنے کی کچھ باتیں	ریحان احمد یوسفی	۸
قرآنیات	آل عمران (۳: ۵۲۔۵۳)	جاوید احمد غامدی	۱۱
معارف نبوی	مشرکین بنی اسماعیل کے لیے ارتداد کی سزا	معز امجد	۱۳
	نماز اور حلال و حرام کا اجر	طالب محسن	۱۶
	نماز کے اوقات ـــــ حدیث ۶	ساجد حمید	۲۵
دین و دانش	اخلاقیات (۱)	جاوید احمد غامدی	۳۱
	اسلام اور مصوری ـــــ جاوید احمد غامدی کا نقطۂ نظر (۱)	منظور الحسن	۳۵
نقطۂ نظر	صبر کیا ہے، اسے کیسے حاصل کریں؟ (۳)	ساجد حمید	۵۵

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

قربانی

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا، لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ، فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ، فَلَهٗ اَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ. (الحج ۲۲:۳۴)

”اور ہر امت کے لیے ہم نے قربانی کی عبادت مقرر کی ہے تاکہ وہ اُن چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے اُن کو بخشے ہیں، اس لیے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو اپنے آپ کو اسی کے حوالے کردو۔ (لیکن یہ وہی کریں گے جن کے دل اپنے پروردگار کے آگے جھکے ہوئے ہیں) اور (اے پیغمبر) اِن جھکنے والوں کو (اُن کے پروردگار کی طرف سے) خوش خبری دو۔“

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دنیا کے تمام قدیم مذاہب میں قربانی اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے۔ اس کی حقیقت وہی ہے جو زکوٰۃ کی ہے، لیکن یہ اصلاً مال کی نہیں، بلکہ جان کی نذر ہے جو اس جانور کے بدلے میں چھڑالی جاتی ہے جسے ہم اس کا قائم مقام بنا کر قربان کرتے ہیں۔ بظاہر یہ اپنے آپ کو موت کے لیے پیش کرنا ہے، لیکن غور کیجیے تو یہ موت ہی حقیقی زندگی کا دروازہ ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ، بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ[1]، (اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انھیں مردہ نہ کہو۔ (وہ مردہ نہیں)، بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم اس زندگی کی حقیقت نہیں سمجھتے)۔ قرآن نے ایک جگہ نماز کے مقابل میں زندگی اور قربانی کے مقابل میں موت کو رکھ کر یہی حقیقت واضح کی ہے کہ نماز جس طرح اللہ کے ساتھ ہماری زندگی ہے، اسی طرح قربانی اس کی راہ میں ہماری موت ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (الانعام ۶:۱۶۲)

”کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی، اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العٰلمین کے لیے ہے۔“

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ ہدایت کی گئی کہ وہ بیٹے کی جگہ ایک مینڈھے کی قربانی دیں اور آیندہ نسلوں میں ہمیشہ کے

۱؎ البقرہ ۲:۱۵۴۔

لیے ایک عظیم قربانی کو اس کی یادگار بنا دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ‘[2] (اور ہم نے اسمٰعیل کو ایک ذبح عظیم کے عوض چھڑا لیا)۔ اس کے معنی یہ تھے کہ ابراہیم کی یہ نذر قبول کر لی گئی ہے اور اب نسلاً بعد نسلٍ لوگ اپنی قربانیوں کے ذریعے سے اس واقعے کی یاد قائم رکھیں گے۔

اس لحاظ سے دیکھیے تو قربانی پرستش کا منتہاے کمال ہے۔ اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے ’بِسْمِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ اَكْبَرُ‘ کہہ کر،[3] ہم اپنے جانوروں کو قیام یا سجدے کی حالت میں[4] اس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہم اپنے آپ کو اس کی نذر کر رہے ہیں۔

یہی نذر اسلام کی حقیقت ہے، اس لیے کہ اسلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ سر اطاعت جھکا دیا جائے اور آدمی اپنی عزیز سے عزیز متاع، حتیٰ کہ اپنی جان بھی اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔ قربانی، اگر غور کیجیے تو اسی حقیقت کی تصویر ہے۔ سیدنا ابراہیم اور ان کے جلیل القدر فرزند نے جب اپنے آپ کو اس کے لیے پیش کیا تو قرآن نے اسے اسلام ہی سے تعبیر کیا ہے: ’فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ‘[5]، (پھر جب ان دونوں نے اپنے آپ کو حوالے کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا)۔ سورۂ حج کی جو آیت اوپر نقل ہوئی ہے، اس میں بھی دیکھ لیجیے، ’فله اسلموا و بشر المخبتین‘ کے الفاظ میں قرآن نے کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی تمھارے دل اگر اپنے معبود کے سامنے جھکے ہوئے ہیں تو اپنے آپ کو اسی کے حوالے کر دو، اس لیے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ قربانی کی روح یہی ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ عبادت خاص اپنی شکر گزاری کے لیے مشروع فرمائی ہے، لہٰذا اس میں کسی دوسرے کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

قربانی کی تاریخ

قربانی کی تاریخ سیدنا آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ ان کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل نے اپنی اپنی نذر اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کی تو ایک کی نذر قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی: ’اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ‘[6]۔ بائیبل میں صراحت ہے کہ ہابیل نے اس موقع پر اپنی بھیڑ بکریوں کے

---

[2] الصافات ۳۷: ۱۰۷۔

[3] بخاری، رقم ۵۵۶۵۔ مسلم، رقم ۱۹۶۶۔

[4] یعنی نحر کے لیے جانور کو کھڑا کر کے اور ذبح کی صورت میں قبلہ رو لٹا کر۔

[5] الصافات ۳۷: ۱۰۳۔

[6] المائدہ ۵: ۲۷۔

کچھ پہلونٹے بچوں کی قربانی پیش کی تھی۔ پیدایش میں ہے:

’’اور آدم اپنی بیوی حوا کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور اس کے قائین پیدا ہوا۔ تب اُس نے کہا: مجھے خداوند سے ایک مرد ملا۔ پھر قائین کا بھائی ہابل پیدا ہوا۔ اور ہابل بھیڑ بکریوں کا چرواہا اور قائین کسان تھا۔ چند روز کے بعد یوں ہوا کہ قائین اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل اور اس کے ہدیے کو منظور کر لیا۔ پر قائین کو اور اُس کے ہدیے کو منظور نہ کیا۔‘‘ (۴: ۱۔۵)

یہ طریقہ بعد میں بھی، ظاہر ہے کہ قائم رہا ہو گا۔ چنانچہ اس کے آثار ہم کو تمام قدیم مذاہب میں ملتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے بعد، البتہ جو اہمیت و عظمت اور وسعت و ہمہ گیری اس عبادت کو حاصل ہوئی ہے، وہ اس سے پہلے، یقیناً حاصل نہیں تھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو کر ہجرت کی تو اس کے ساتھ ہی دعا فرمائی کہ پروردگار، تو مجھے صالح اولاد عطا فرما۔ یہ دعا قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک فرزند کی ولادت کی خوش خبری دی۔ یہ فرزند اسمٰعیل تھے۔ قرآن کا بیان ہے کہ یہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچے تو ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہو رہی ہے کہ اس بیٹے کو اپنے پروردگار کی خاطر قربان کر دیں۔ یہ ہدایت اگرچہ خواب میں ہوئی تھی اور خواب کی باتیں تاویل و تعبیر کی محتاج ہوتی ہیں، چنانچہ اس خواب کی تعبیر بھی یہی تھی کہ وہ بیٹے کو معبد کی خدمت کے لیے اللہ تعالیٰ کی نذر کر دیں، اس سے ہرگز یہ مقصود نہ تھا کہ وہ فی الواقع اسے ذبح کر دیں، لیکن خدا کے اس صداقت شعار بندے نے کوئی تعبیر نکالنے کے بجائے من و عن اس کی تعمیل کا فیصلہ کر لیا اور اس راہ میں پہلا قدم یہ اٹھایا کہ فرزند کے حوصلے کا اندازہ کرنے کے لیے اپنا خواب اسے بتایا۔ سیدنا اسمٰعیل نے اس خواب کو خدا کا حکم سمجھا اور فوراً جواب دیا کہ ابا جان، آپ بے دریغ اس کی تعمیل کریں۔ ان شاء اللہ، آپ مجھے پوری طرح ثابت قدم پائیں گے۔ بچے کے جواب سے مطمئن ہو کر ابراہیم اس کو مروہ کی پہاڑی کے پاس لے گئے اور قربانی کے لیے پیشانی کے بل لٹا دیا۔ قریب تھا کہ چھری چل جاتی، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا آئی: ابراہیم تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ یہ ایک بڑی آزمایش تھی، تم اس میں کامیاب ہوئے، لہٰذا اب مزید کسی اقدام کی ضرورت نہیں رہی۔ چنانچہ ابراہیم کے اس فرزند جلیل کو اللہ تعالیٰ نے ایک مینڈھے کی قربانی کے عوض چھڑا لیا اور اس واقعے کی یادگار کے طور پر ہر سال اسی تاریخ کو قربانی کی ایک عظیم روایت ہمیشہ کے لیے قائم کر دی گئی۔ یہی قربانی ہے جو حج و عمرہ کے موقع پر اور عیدالاضحیٰ کے دن ہم پورے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

قَالُوا: ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا، فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ، فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ.

’’انھوں نے کہا: اس کے لیے ایک چنائی چنو اور اسے آگ میں جھونک دو۔ اس طرح انھوں نے اس کے

وَقَالَ: اِنِّیۡ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیۡ سَیَهۡدِیۡنِ . رَبِّ هَبۡ لِیۡ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ، فَبَشَّرۡنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیۡمٍ . فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعۡیَ، قَالَ: یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُكَ، فَانۡظُرۡ مَاذَا تَرٰی ؟ قَالَ: یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ سَتَجِدُنِیۡۤ، اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ، مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ. فَلَمَّاۤ اَسۡلَمَا وَتَلَّهٗ لِلۡجَبِیۡنِ، وَنَادَیۡنٰهُ اَنۡ یّٰۤاِبۡرٰهِیۡمُ، قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡیَا، اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ، اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡبَلٰٓؤُا الۡمُبِیۡنُ، وَفَدَیۡنٰهُ بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ.

(الصافات ۳۷: ۹۷-۱۰۷)

خلاف ایک چال کرنی چاہی تو ہم نے انھی کو نیچا دکھا دیا۔ اور (ابراہیم نے یہ دیکھا تو) کہا: میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں، وہ میری رہنمائی فرمائے گا۔ پروردگار، مجھے صالح اولاد عطا فرما۔ (اُس نے یہ دعا کی) تو ہم نے اسے ایک بردبار فرزند کی بشارت دی۔ پھر جب وہ اس کے ساتھ چلنے پھرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک دن) اُس نے کہا: بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اب بتاؤ، تمھاری کیا رائے ہے؟ اُس نے جواب دیا: ابا جان، آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے، اس کی تعمیل کیجیے۔ آپ ان شاء اللہ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔ آخر کو جب دونوں نے اپنے آپ کو حوالے کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیم، تو نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ بے شک ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمایش تھی۔ (ابراہیم اس میں کامیاب ہوا) اور (اِس کے نتیجے میں) اسمٰعیل کو ہم نے ایک بڑی قربانی کے عوض چھڑا لیا۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قربانی کا مقصد

قربانی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے۔ ہم اپنی جان کا نذرانہ قربانی کے جانوروں کو اس کی علامت بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو گویا اسلام و اخبات کی اس ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں جس کا اظہار سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی سے کیا تھا۔ اس موقع پر تکبیر و تہلیل کے الفاظ اسی مقصد سے ادا کیے جاتے ہیں۔ قرآن نے یہ مقصد اس طرح واضح فرمایا ہے:

لَنۡ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوۡمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنۡ یَّنَالُهُ التَّقۡوٰی مِنۡكُمۡ، كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمۡ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمۡ،

''اللہ کو نہ (تمھاری) اِن (قربانیوں) کا گوشت پہنچتا ہے، نہ خون، بلکہ صرف تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اُس نے اِسی طرح اِن کو تمھاری خدمت میں لگا دیا ہے تا کہ اللہ نے

وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ. (الحج ۲۲: ۳۷)

جو ہدایت تمھیں بخشی ہے، اُس پر تم اُس کی تکبیر کرو۔ (یہی طریقہ ہے اُن کا جو خوبی کا رویہ اختیار کریں) اور (اے پیغمبر) اِن خوب کاروں کو بشارت دو۔“

قربانی کا قانون

قربانی کا جو قانون مسلمانوں کے اجماع اور تواتر عملی سے ہم تک پہنچا ہے، وہ یہ ہے:

قربانی انعام کی قسم کے تمام چوپایوں کی ہو سکتی ہے،

اس کا جانور بے عیب اور اچھی عمر کا ہونا چاہیے،

قربانی کا وقت یوم النحر ۱۰؍ ذوالحجہ کو عیدالاضحیٰ کی نماز سے فراغت کے بعد شروع ہوتا ہے،

اس کے ایام وہی ہیں جو مزدلفہ سے واپسی کے بعد منیٰ میں قیام کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ سورۂ حج کی آیات میں 'اَيَّـامٍ مَـعْلُوْمَاتٍ' سے یہی مراد ہیں[7]۔ اصطلاح میں انھیں ایام تشریق کہا جاتا ہے۔ قربانی کے علاوہ ان ایام میں یہ بھی مشروع ہے کہ ہر نماز کی جماعت کے بعد تکبیریں کہی جائیں۔ نمازوں کے بعد تکبیر کا یہ حکم مطلق ہے، اس کے کوئی خاص الفاظ شریعت میں مقرر نہیں کیے گئے۔

قربانی کا گوشت لوگ خود بھی بغیر کسی تردد کے کھا سکتے اور دوسروں کو بھی کھلا سکتے ہیں۔ 'فَكُلُوْا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ'[8] کے الفاظ میں قرآن نے اس کی صراحت کر دی ہے۔

قربانی کا قانون یہی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے البتہ، اس کے بارے میں چند باتوں کی وضاحت فرمائی ہے:

اول یہ کہ قربانی ہر حال میں عید کی نماز کے بعد کی جائے گی۔ یہ اگر پہلے کر لی گئی ہے تو محض ذبیحہ ہے، اسے عیدالاضحیٰ کی قربانی قرار نہیں دیا جا سکتا[9]۔

دوم یہ کہ قربانی کے لیے اچھی عمر یہ ہے کہ بھیڑ یا بکری کا بچہ کم سے کم ایک سال، گائے بیل دو سال اور اونٹ یا اونٹنی کم سے کم پانچ سال کی ہونی چاہیے۔ یہ میسر نہ ہوں تو مینڈھا ذبح کر لیا جائے۔ یہ اگر چھ ماہ کا بھی ہو تو کفایت کرے گا[10]۔

---

[7] ۲۲: ۲۸۔ ”اور چند متعین دنوں میں اُن چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اُس نے اُن کو بخشے ہیں۔“

[8] الحج ۲۲: ۳۶۔ ”سو اِس میں سے خود بھی کھاؤ اور اُن کو بھی کھلاؤ جو قناعت کیے بیٹھے ہیں اور اُن کو بھی جو مانگنے کے لیے آجائیں۔“

[9] بخاری، رقم ۹۵۱، ۹۵۴، ۹۸۵۔ مسلم، رقم ۹۶۰، ۱۹۶۱، ۱۹۶۲۔

[10] مسلم، رقم ۱۹۶۳۔ ابوداؤد، رقم ۲۷۹۹۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوم یہ کہ گائے بیل اور اونٹ یا اونٹنی کی قربانی میں ایک سے زیادہ لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔ یہ شرکا اگر سات بھی ہوں تو مضایقہ نہیں ہے، بلکہ روایتوں میں آیا ہے کہ اونٹ کی قربانی میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ایک موقع پر دس افراد شریک ہوئے تو آپ نے منع نہیں فرمایا۔[11]

چہارم یہ کہ قربانی ایک نفل عبادت کے طور پر عید الاضحیٰ کے علاوہ بھی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے جب عقیقے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: تم میں سے جو بچے کی پیدایش پر قربانی کرنا چاہے، کر لے۔[12]

۱۱؎ ابوداؤد، رقم ۲۸۰۸۔ ترمذی، رقم ۱۵۰۱۔

۱۲؎ الموطا، رقم ۱۰۶۶۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ریحان احمد یوسفی

قربانی: سوچنے کی کچھ باتیں

عیدالاضحیٰ کی آمد آمد ہے۔ ہر سال اس موقع پر قربانی کے جانوروں کی بہار آتی ہے۔ ہر گھر میں اسی بات کا تذکرہ ہوتا ہے کہ گائے خریدی جائے، بکرا لیا جائے یا کہیں حصہ ڈال دیا جائے۔ جہاں قربانی کے جانور آ جاتے ہیں وہاں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں کہ کس کا جانور زیادہ اچھا اور قیمتی ہے۔ جو لوگ مہنگے جانور خرید کر لاتے ہیں، وہ بڑے فخر سے اپنے جانوروں کی نمایش کرتے ہیں، جبکہ کمزور جانوروں کے مالک ان کی قیمت زیادہ بتا کر اپنا بھرم رکھتے ہیں۔ غرض یہ کہ مقابلہ بازی کی اک فضا ہر جگہ طاری ہو جاتی ہے۔ جو لوگ قربانی کی استطاعت نہیں رکھتے، ان کا غم صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اس مقابلے سے کیوں باہر ہیں یا پھر یہ کہ اس موقع پر 'گوشت' کی خود کفالت میں وہ دوسروں کے محتاج ہوں گے۔

جانوروں کی خریداری کے بعد گھر کے مردوں کی اگلی فکر قصاب کی تلاش اور قربانی کے دن اس کی دستیابی کو یقینی بنانا ہوتا ہے، جبکہ خواتین کے سامنے قربانی کے بعد گوشت کی جمع و تقسیم اور پھر اس کے پکانے کے تھکا دینے والے مراحل ہوتے ہیں۔ بچے جانوروں کو گھمانے اور کھلانے پلانے میں مگن رہتے ہیں۔ ان کے اس شوق کا منتہاے کمال عید کے دن ذبح ہوتے جانوروں کا نظارہ ہے۔ غرض یہ کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر دین اسلام کی یہ عظیم عبادت لوگوں میں اگر کسی پہلو سے اہم ہے تو وہ محض 'جانور' اور ان کے 'گوشت' کے حوالے سے ہے۔ دین کے حوالے سے اگر کوئی چیز زیر بحث آتی بھی ہے تو وہ قربانی کی عبادت کا تاریخی پس منظر اور اس کے فقہی مسائل ہیں۔

دین اسلام میں قربانی کی حیثیت ایک عبادت کی ہے۔ اور دین خداوندی میں عبادات کی حقیقت یہ ہے کہ ان کے ذریعے سے بندہ اپنے پروردگار کے ساتھ اپنے تعلق کی یاددہانی حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ قربانی کی یہ عبادت بندے اور اس کے رب کے درمیان تعلق کا وہ مظہر ہے جسے سرعنوان بنا کر وہ اپنے مالک کی خدمت میں اپنا یہ پیام بندگی بھیجتا ہے:

''اے پروردگار، آج میں ایک جانور تیرے نام پر ذبح کر رہا ہوں، اگر تیرا حکم ہوا تو میں اپنی جان بھی اِسی طرح تیرے

حضور میں پیش کر دوں گا۔‘‘

دراصل اس دنیا میں بدنی اور مالی عبادات کے مواقع نماز وانفاق وغیرہ کی صورت میں کثرت سے سامنے آتے رہتے ہیں، جن سے ہم اپنے پروردگار کے ساتھ اپنے تعلق کی یاددہانی حاصل کرتے اور اسے زندہ کرتے ہیں، تاہم خدا کے لیے جان دے دینا ’اسلام‘ (یعنی اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دینے) کا سب سے بلند مقام ہے اور اس کے مواقع شاذ ہی زندگی میں آتے ہیں۔ اس لیے قربانی کی یہ عبادت اُس کے علامتی اظہار کے طور پر مقرر کی گئی ہے۔ گویا ایک بندۂ مومن اس عظیم عبادت کے ذریعے سے اپنے رب کے سامنے یہ اقرار کرتا ہے کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا سب تیرے لیے ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

’’اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مشروع کی ہے تاکہ اللہ نے اُن کو جو چوپائے بخشے ہیں، اُن پر وہ (ذبح کرتے ہوئے) اُس کا نام لیں۔ پس تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے چنانچہ تم اپنے آپ کو اُسی کے حوالے کر دو۔ اور خوش خبری دو اُن لوگوں کو جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔‘‘ (الحج ۲۲:۳۴)

یہ آیت بتاتی ہے کہ قربانی کی عبادت اپنی جان کو اپنے معبود کی نذر کر دینے کا علامتی اظہار ہے۔ اس کے ذریعے سے بندہ اپنے وجود کو آخری درجہ میں اپنے آقا کے حوالے کرنے کا اعلان کرتا ہے۔ بندۂ مومن کے یہ جذبات اس کے مالک تک پہنچ جاتے ہیں۔ جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو ابدی رحمتوں کے لیے چن لیتا ہے۔ مزید برآں دنیا میں بھی وہ ان جانوروں کا گوشت انھیں کھانے کی اجازت دے کر انھیں یہ پیغام دیتا ہے کہ اپنی جان مجھے دے کر بھی تم مجھے کچھ نہیں دیتے، بلکہ دینے والا میں ہی رہتا ہوں۔ یہ گوشت کھاؤ اور یاد رکھو کہ مجھ سے سودا کرنے والا دنیا و آخرت دونوں میں نقصان نہیں اٹھاتا۔

ایک طرف قربانی کی یہ عظیم عبادت اور اس میں پوشیدہ قربت رب کی یہ حکمت ہے اور دوسری طرف ہمارا وہ طرز عمل ہے جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ جس میں ایک عام آدمی کا ذہن کبھی بھولے سے بھی قربانی کی اس حقیقت کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ریاکاری اور نمود و نمایش کا وہ شائبہ تعلق باللہ کی یاددہانی کی اس عظیم عبادت میں اس طرح شامل ہو جاتا ہے کہ جس کے بعد لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ قربانی کے ذریعے سے اپنی بندگی کا اظہار تو دور کی چیز ہے، رسول اللہ کے ارشاد کے مطابق تو مخلوق کی نگاہ میں نمایاں ہونے کی نیت سے آدمی اگر حقیقت میں بھی اپنی جان دے دے تب بھی روز قیامت میں ایسے ’’شہید‘‘ کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

ایک آخری بات اس ضمن میں یاد رکھنے کی یہ ہے کہ دین اسلام کا اصل مقصود انسان کا ’تزکیہ‘ ہے۔ یعنی انسان کو پاکیزہ بنانا۔ تاہم قربانی کے اس عمل میں ہم لوگ نہ صرف جانور ذبح کرتے ہیں، بلکہ اسلام کا یہ مقصود یعنی پاکیزگی بھی ذبح کر دیتے ہیں۔ جگہ جگہ گندگی کے جو مظاہر عید الاضحیٰ کے موقع پر دیکھنے میں آتے ہیں اس کی توقع کسی اچھے مسلمان سے تو کیا ایک اچھے انسان سے بھی نہیں کی جا سکتی۔ قرآن پاک میں قربانی کے جانوروں کے متعلق ارشاد ہوا ہے:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

''اللہ کو تمھاری ان قربانیوں کا گوشت یا خون کچھ بھی نہیں پہنچتا، بلکہ صرف تمھارا تقویٰ پہنچے گا۔'' (الحج ۲۲: ۳۷)

تقویٰ اور بندگی کی دلی کیفیات تو ہمارے ہاں پہلے ہی ناپید ہیں۔ اس پر مزید ستم ہم یہ کرتے ہیں کہ گوشت اپنے فریج میں رکھ کر ہم زبان حال سے رب العالمین کی بارگاہ اقدس میں صرف گندگی اور غلاظت کے ڈھیر بھیجتے ہیں۔ چنانچہ قربانی کے دنوں میں اس کی حکمت و مصلحت کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اپنے گھر کی طرح اپنے علاقے کو صاف رکھنا ہماری دینی ذمہ داری ہے۔ جس کی خلاف ورزی کم از کم ایک دینی تہوار کے موقع پر اور بالخصوص ایک عبادت کو انجام دیتے ہوئے بالکل نہیں ہونی چاہیے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۱۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ، قَالَ: مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ؟ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ: نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ، اٰمَنَّا بِاللّٰهِ، وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ،

پھر جب عیسیٰ نے محسوس کیا کہ (میری قوم کے) یہ لوگ ہر حال میں آمادۂ انکار ہیں تو اُس نے (حواریوں[۱۰۲] سے) کہا: کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے[۱۰۳]؟ حواریوں نے جواب دیا: ہم ہیں اللہ کے مددگار[۱۰۴]، ہم اللہ[۱۰۵] پر

[۱۰۲] یہ لفظ غالباً عبرانی سے عربی زبان میں آیا ہے۔ اس کے معنی قریب قریب وہی ہیں جو ہمارے ہاں لفظ انصار کے ہیں۔ یعنی حامی، ناصر اور مددگار۔ یہاں یہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے ان خاص شاگردوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو آپ پر ایمان لائے، ہر قسم کے سرد و گرم حالات میں آپ کی مدد کی اور بالآخر آپ کی دعوت کے نقیب بن کر بنی اسرائیل کی ایک ایک بستی میں پہنچ گئے۔

[۱۰۳] یعنی مسیح علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل کے علما اور سرداروں کے رویے سے یہ محسوس کر لیا کہ ان پتھروں میں جونک لگانا ممکن نہیں ہے اور اب یہ انکار کا فیصلہ کر چکے ہیں تو اپنے ساتھیوں سے مدد چاہی کہ اللہ تعالیٰ آگے کے مراحل میں جو ذمہ داری بھی انھیں دیں، اس کو پورا کرنے میں وہ ان کے مددگار بن کر کھڑے ہوں۔ اس کے لیے جو جملہ ان کی زبان سے نکلا ہے، اس سے، اگر غور کیجیے تو استاذ امام کے الفاظ میں جس طرح جوش دعوت کا اظہار ہو رہا ہے، اسی طرح یہ بات بھی نمایاں ہو رہی ہے کہ اس دعوت کے ساتھ وہ گویا یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ میں تو اپنے رب کی راہ پر، یہ دیکھو، چل کھڑا ہوا ہوں۔ اب جس

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ، وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ، فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

ایمان لائے ہیں اور آپ گواہ رہیے کہ ہم نے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ پروردگار، ہم نے اُسے مان لیا ہے جو آپ نے نازل کیا ہے اور (اِس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے) رسول کی پیروی اختیار کر لی ہے۔ سو آپ ہمیں اس کی گواہی دینے والوں میں لکھ لیں[۱۰۶]۔ ۵۲۔۵۳

کے اندر حوصلہ ہو، وہ اس وادی پرخار میں میرا ساتھ دے۔

[۱۰۴] اصل الفاظ ہیں: 'نحن انصار اللّٰه'۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کی طرف سے 'من انصاری الی اللّٰه' کی دعوت کے جواب میں 'نحن انصارك الی اللّٰه' کہنے کے بجائے یہ الفاظ جس مدعا پر دلالت کرتے ہیں، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

''سیدنا مسیح کے ارشاد میں 'الی' اس مسافت کو واضح کر رہا ہے جو راہ اور منزل کے درمیان واقع ہے اور ایک داعی کی حیثیت سے ان کے شایان شان یہی تھا کہ اس راہ کی مشکلات اور درمیان کی مسافت سے آگاہ کر دیں، لیکن حواریین نے جواب میں جوش فدویت کی ایک ہی جست میں گویا ساری مسافت طے کر لی ہے اور دعوت حق کے اس نازک مرحلے میں ان کے جذبۂ ایمان و اسلام کے شایان شان بات یہی تھی۔'' (تدبرقرآن ۲/۹۹)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

[۱۰۵] اس سے آگے ان تضمنات کی تفصیل ہے جو 'من انصاری الی اللّٰه' کے اجمال میں چھپے ہوئے تھے۔ اس سے واضح ہے کہ حواری اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اللہ کے انصار ہونے سے کیا مراد ہے اور آدمی کو اس کے لیے کیا کچھ کرنا چاہیے۔

[۱۰۶] مطلب یہ ہے کہ یہ حق ہم پر واضح ہوا ہے تو اب ہم اس کے چھپانے والے نہیں، بلکہ دوسروں کے لیے اس کی گواہی دینے والے بن کر رہیں گے۔ لہٰذا قیامت کے دن ہمارا نام انھی لوگوں میں لکھا جائے، حق کو چھپانے والوں میں نہ لکھا جائے۔

[باقی]

معز امجد

مشرکین بنی اسماعیل کے لیے ارتداد کی سزا

روی[1] أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم قال: من بدل دینہ[2] فاقتلوہ[3].

روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (مشرکین بنی اسماعیل میں سے مسلمان ہونے کے بعد) جو اپنا دین بدل لے اسے قتل کر دو[1]۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ترجمے کے حواشی

۱۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف خدا کے نبی، بلکہ رسول بھی تھے اور قرآن مجید کے مطابق جب کوئی رسول کسی قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے تو اس کے انکار کی صورت میں اس کی قوم کے مشرکین کو خدا کی زمین پر زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں رہتا۔ ایسے لوگوں کو رسول کی دعوت سمجھنے اور اس کے خلاف اپنے اعتراضات پیش کرنے کی پوری مہلت دی جاتی ہے۔ اور جب خدا تعالیٰ کی علیم وخبیر ذات یہ جان لیتی ہے کہ رسول خدا کا سچا ہونا ان پر ہر لحاظ سے واضح ہو چکا ہے اور ان کے پاس رسول کو جھٹلانے کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا اور ان کا جھٹلانا محض انانیت اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے تو خدا اپنے رسول اور اس کے ماننے والوں کو اس قوم کا علاقہ چھوڑ دینے کا حکم دیتا ہے اور رسول کا انکار کرنے والے مشرکین کو کسی نوعیت کی قدرتی آفت بھیج کر تباہ کر دیتا ہے۔ قرآن مجید نے پچھلے رسولوں ـــــ نوح، ہود، شعیب، صالح اور موسیٰ علیہم السلام ـــــ کی قوموں کا ذکر کر کے رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی اسی سنت کا حوالہ دیا ہے۔ قرآن مجید محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے براہ راست مخاطبین یعنی مشرکین بنی اسماعیل کو بھی خبر دار کرتا ہے کہ اگر انھوں نے خدا کے رسول کو نہ ماننے کی روش اپنائے رکھی تو ان کا انجام بھی انھی

اقوام کی طرح ہوگا۔(دیکھیے سورۂ قمر خصوصاً آیات ۴۳۔۴۵) چنانچہ قرآن مجید سے یہ واضح ہے کہ جب خدا کسی قوم کی طرف رسول بھیجتا ہے تو اس قوم کے مشرکین کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا کہ وہ ایمان لائیں یا مرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

قرآن مجید ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے والے مشرکین کے خلاف اس موت کی سزا کا نفاذ کس طرح ہوا۔اس کے مطابق پچھلی مشرک قومیں رسول کی تکذیب کے نتیجے میں اگرچہ مختلف قدرتی آفات کے ذریعے سے تباہ کی گئیں، تاہم رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین کو اہل ایمان کے ہاتھوں سزا دینے کا فیصلہ کیا گیا (التوبہ ۹:۱۴۔۱۶)۔ چنانچہ اہل ایمان کو یہ حکم دیا گیا کہ مشرکین اگر اسلام قبول نہ کریں تو انھیں بلا استثنا قتل کر دیا جائے (۹:۵)، جبکہ دوسری طرف یہود و نصاریٰ (جو کہ اصلاً مذہب شرک کے دعوے دار نہ تھے) ان کے بارے میں کہا گیا کہ اگر وہ ایمان نہ لائیں تو انھیں مسلم علاقوں میں جزیہ دے کر مسلمانوں کے زیر دست زندہ رہنے کی آزادی حاصل رہے گی (۹:۲۹)۔

چنانچہ قرآن مجید کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم بنی اسماعیل کے مشرکین اگر آپ پر ایمان نہ لاتے تو رسولوں کی بعثت کے بارے میں قانون خداوندی کے مطابق انھیں لازماً موت کی سزا دی جاتی۔اس بات کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر وہ ایمان لانے کے بعد اپنا دین بدل لیتے تو انھیں پھر بھی وہی موت کی سزا ملنی چاہیے تھی۔ مذکورہ بالا روایت میں یہی بات بیان ہوئی ہے کہ مشرکین بنی اسماعیل اگر ایمان لانے کے بعد دین اسلام چھوڑیں تو لازماً قتل کیے جائیں۔ چنانچہ ہمارے نزدیک اس روایت میں جو بات بیان ہوئی ہے، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم مشرکین بنی اسماعیل کے ساتھ خاص تھی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

متن کے حواشی

۱۔ یہ بخاری کی روایت، رقم ۲۸۵۴ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

بخاری، رقم ۲۸۵۴، ۶۵۲۴، ۶۵۲۵۔ مسلم، رقم ۱۷۳۳۔ موطا، رقم ۱۴۱۳۔ ترمذی، رقم ۱۴۵۸۔ ابن ماجہ، رقم ۲۵۳۵۔ ابوداؤد، رقم ۴۳۵۱، ۴۳۵۴۔ نسائی، رقم ۴۰۵۹، ۴۰۶۰، ۴۰۶۱، ۴۰۶۲، ۴۰۶۳، ۴۰۶۴، ۴۰۶۵، ۴۰۶۶۔ سنن الکبریٰ، رقم ۳۵۲۲، ۳۵۲۳، ۳۵۲۴، ۳۵۲۵، ۳۵۲۶، ۳۵۲۷، ۳۵۲۸، ۳۵۲۹۔ بیہقی، رقم ۱۶۵۹۷، ۱۶۵۹۸، ۱۶۵۹۹، ۱۶۶۳۵، ۱۶۶۳۶، ۱۶۶۳۷، ۱۶۶۵۴، ۱۶۶۵۸، ۱۷۸۴۱۔ احمد بن حنبل، رقم ۱۸۷۱، ۲۵۵۱، ۲۵۵۲، ۲۹۶۸، ۱۹۶۸۱، ۲۲۰۶۸۔ ابویعلیٰ، رقم ۲۵۳۲، ۲۵۳۳۔ مصنف عبدالرزاق، رقم ۹۴۱۳، ۱۸۷۰۵، ۱۸۷۰۶۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۹۹۲، ۲۹۰۰۶، ۳۲۷۲۸، ۳۳۱۴۳، ۳۶۴۹۱۔ ابن حبان، رقم ۴۴۷۵، ۵۶۰۶۔ حمیدی، رقم ۵۳۳۔

۲۔ بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۲۰۶۸ میں 'من بدل دینه' (جو اپنا دین بدل لے) کے بجائے 'من رجع

عن دینہ '(جو اپنے دین سے پلٹ جائے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں، جبکہ موطا، رقم ۱۴۱۳ میں یہی مضمون 'من غیر دینہ' (جو اپنا دین تبدیل کر لے) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے، اور عبدالرزاق، رقم ۱۸۷۰۶ میں 'من بدل عن دینہ' (جو اپنے موجودہ دین سے پلٹ کر اپنا دین تبدیل کر لے) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

۳۔ بعض روایات مثلاً موطا، رقم ۱۴۱۳ میں 'فاقتلوہ' (تو اسے قتل کر دو) کے بجائے 'فاضربوا عنقہ' (تو اس کی گردن مار دو) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ و ترتیب: اظہار احمد

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

نماز اور حلال و حرام کا اجر

[مسلم، کتاب الایمان ۱۵]

عن جابر رضی اللّٰه عنه قال: أتی النبی صلی اللّٰه علیه و سلم النعمان بن قوقل . فقال: یا رسول اللّٰه، أرأیت إذا صلیت المکتوبة و حرمت الحرام و أحللت الحلال، أأدخل الجنة . فقال النبی صلی اللّٰه علیه و سلم: نعم.

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نعمان بن قوقل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے پوچھا: آپ کی کیا رائے ہے، جب میں فرض نماز پڑھتا رہوں اور حرام کو حرام اور حلال کو حلال رکھوں تو کیا میں جنت میں چلا جاؤں گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔''

ایک دوسرے متن میں نعمان بن قوقل کے قول میں: 'ولم أزد علی ذلك شیئا' (اور اس پر کسی چیز کا اضافہ نہ کروں) کا جملہ بھی نقل ہوا ہے۔

عن جابر رضی اللّٰه عنه: أن رجلا سأل رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم. فقال: أرأیت إذا صلیت الصلوات المکتوبات و صمت رمضان

وأحللت الحلال وحرمت الحرام ولم أزد على ذلك شيئا، أأدخل الجنة؟ قال: نعم. قال: واللّٰہ لا أزيد على ذلك شيئا.

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: آپ کی کیا رائے ہے، جب میں فرض نمازیں ادا کرتا رہوں، رمضان کے روزے رکھتا رہوں، حلال کو حلال اور حرام کو حرام رکھوں اور اس پر کسی چیز کا اضافہ نہ کروں تو کیا میں جنت میں داخل ہو جاؤں گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اس نے کہا: میں اس پر کسی چیز کا اضافہ نہیں کروں گا۔''

معنی

سوال یہاں بھی وہی ہے جو پچھلی روایتوں میں پوچھا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہاں کچھ دینی امور بیان کر کے جنت کے بارے میں سوال کیا گیا ہے اور پچھلی روایتوں میں سوال براہ راست تھا۔ وہاں جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے بعض بنیادی اعمال کا ذکر کیا تھا۔ اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال میں بیان کیے گئے اعمال پر جنت ملنے کی خبر دی ہے۔ ان روایات میں جہاں اس بات کا احتمال ہے کہ پوری بات روایت نہ ہوئی ہو۔ وہاں یہ بات بھی ممکن ہے کہ اتنی ہی بات ہوئی ہو جو بیان کر دی گئی ہے۔ جنت کے حصول کی بنیادی شرط ایمان اور عمل صالح ہے۔ اعمال صالحہ میں وہ اعمال جنھیں فرض کر دیا گیا ہے ایک مسلمان پر لازم ہیں۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے ہر شخص پر واضح تھی۔ چنانچہ روایات میں ان میں سے چند کا ذکر بطور علامت ہے۔ گویا ان روایات کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ایمان میں درست ہو گا۔ دین کے اوامر و نواہی کی تعمیل کرے گا۔ وہ جنت میں جانے کی راہ پر گام زن ہے۔ اگر اس کے نامۂ اعمال میں نیکیاں غالب ہوئیں تو یقیناً جنت میں جائے گا۔

اس طرح کی روایتوں سے ایک معنی یہ اخذ کیے جاتے ہیں کہ ترک نوافل میں کچھ حرج نہیں ہے۔ اس سے پہلے ہم یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ ان روایتوں میں منشائے کلام یہ نہیں ہے۔ نوافل کی اپنی اہمیت ہے اور وہ دوسری روایتوں میں بصراحت بیان ہوئی ہے۔ سائل کا منشا صرف اپنے ارادے کی پختگی کا اظہار ہے۔

متون

اس روایت کے تین متن تو مسلم ہی نے جمع کر دیے ہیں۔ ان کے علاوہ متون میں ترتیب اجزا مختلف ہے۔ ایک روایت

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

میں رمضان کے روزوں کا ذکر ہے۔ روایات کے متون میں اس طرح کے فرق سے اندازہ ہوتا ہے کہ راوی بسا اوقات اپنا فہم بھی روایت میں شامل کر دیتے ہیں۔

کتابیات

دیگر متون کے لیے دیکھیے: احمد، رقم ۴۴۳۴، ۱۴۷۸۹، ۱۴۷۸۹۔ مستدرک، رقم ۶۴۹۶۔ بیہقی، رقم ۱۹۴۸۹۔ ابویعلیٰ، رقم ۱۹۴۰، ۲۲۹۵۔ المعجم الاوسط، رقم ۸۶۰۷۔

—— ۱۶ ——

عـن ابـن عمر رضی اللّٰه عنه عن النبی صلی اللّٰه علیه و سلم قال: بنی الإسـلام عـلـی خـمسة، عـلی أن یؤحد اللّٰه و اقام الصلاة و ایتاء الزکاة وصیـام رمضان و الحج . فـقـال رجـل: الحج وصیام رمضان. قال: لا، صیـام رمضان و الحج . هـکـذا سـمـعتـه عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم.

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر ہے: اس بات پر کہ اللہ کو ایک مانا جائے، نماز کے اہتمام پر، زکوٰۃ کی ادائیگی پر، رمضان کے روزوں پر، اور حج پر۔ ایک آدمی نے پوچھا: حج اور رمضان کے روزے؟ انھوں نے کہا: نہیں، رمضان کے روزے اور حج۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے ہی سنا ہے۔''

لغوی مباحث

اصل میں 'بنی الاسلام علی خمسة' ہے۔ 'بنی' کا فعل تعمیر کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ یہ ایک متعدی فعل ہے اور یہاں مجہول استعمال ہوا ہے۔ اسلام اسی کا نائب فاعل ہے۔ یہاں یہ جملہ نحوی اعتبار سے مکمل ہے۔ اس کے بعد 'عـلـی خمسة' ہے۔ سوال یہ ہے کہ 'علی' کس مفہوم میں ہے۔ اگر اسے اس کے عام مفہوم میں لیا جائے تو اس کے معنی یہ بنتے ہیں کہ اسلام کی اصل عمارت ان پانچ چیزوں کے اوپر کھڑی ہے۔ ظاہر ہے یہ بات متکلم کا منشا نہیں ہو سکتی۔ دوسری صورت یہ ہے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کہ اسے ' من ' کے مفہوم میں لیا جائے۔ اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام ان پانچ چیزوں پر مشتمل ہے۔

روایت میں پانچ 'خمسة' کا معدود مذکور نہیں ہے۔ عربی میں جب معدود کی تفصیل آگے آ رہی ہو تو اسے بالعموم حذف کر دیا جاتا ہے۔ بعض روایات میں 'خمس' بھی آیا ہے۔ معدود اگر مذکر ہو تو عدد مونث اور مونث ہو تو مذکر آتا ہے۔ جب معدود محذوف ہو تو متکلم خیال میں موجود معدود کے اعتبار سے صیغہ اختیار کرتا ہے۔ یہاں معدود معنوی چیزیں ہیں اس لیے مذکر عدد کے ساتھ خصال یا دعائم کے جیسا کوئی لفظ اور مونث عدد کے ساتھ ارکان یا اشیا جیسا کوئی لفظ محذوف مانا جائے گا۔

عدد کے حوالے سے بعض شارحین نے یہ بحث بھی کی ہے کہ آیا اس سے پانچ کے علاوہ کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عام بول چال میں عدد محض نمایاں کرنے کے لیے بول لیا جاتا ہے۔ اس سے بعض اوقات تحدید مراد نہیں ہوتی، لیکن اس روایت میں یہ پہلو نہیں ہے یہاں تحدید ہی مراد ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث جبریل میں یہی پانچ چیزیں بیان کی ہیں۔

اصل میں حرف عطف واؤ ہے۔ ایک متن میں بیان ہوا ہے کہ ایک سننے والے نے جب ارکان کی ترتیب کو بدلا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک خاص ترتیب پر اصرار کیا۔ اس سے بعض شارحین نے یہ بحث کی ہے کہ واؤ ترتیب کے معنی پر ہے۔ واؤ کے بارے میں یہ واضح ہے کہ یہ ترتیب کو لازم نہیں کرتی۔ یہ ارکان احادیث میں مختلف ترتیب سے آئے ہیں ان میں سے ہر ترتیب میں کوئی نہ کوئی معنویت پیدا کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا اس پہلو سے روایت پر غور محض تکلف ہے۔

عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنه عن النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم قال: بنی الإسلام علی خمس علی أن یعبد اللّٰہ و یکفر بما دونه و اقام الصلاة و ایتاء الزکاة و حج البیت و صوم رمضان .

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر ہے: اس چیز پر کہ اللہ کی بندگی کی جائے اور اس کے سوا ہر چیز کا انکار کیا جائے، نماز کے اہتمام پر، زکوٰۃ کی ادائیگی پر، بیت اللہ کے حج پر اور رمضان کے روزوں پر۔''

عن عبد اللّٰہ بن عمر قال: رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم بنی

الاسلام على خمس شهادة أن لا إلٰه الا اللّٰه وأن محمدًا عبده ورسوله واقام الصلاة وايتاء الزكاة وحج البيت وصوم رمضان.

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر ہے۔ اس بات کے برملا اظہار پر کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں، نماز کے اہتمام پر، زکوٰۃ کی ادائیگی، بیت اللہ کے حج پر اور رمضان کے روزوں پر۔''

يحدث طاوسا أن رجلا قال: لعبد اللّٰه بن عمر: ألا تغزو . فقال: انى سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: ان الاسلام بنى علىٰ خمس شهادة ان لا إلٰه الا اللّٰه واقام الصلاة وايتاء الزكاة وصيام رمضان وحج البيت.

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

''طاوس بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی[1] نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا آپ جنگ میں شریک نہیں ہوں گے۔ انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر ہے: اس بات کا برملا اظہار کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، نماز کا اہتمام، زکوٰۃ کی ادائیگی، رمضان کے روزے اور بیت اللہ کا حج۔''

معنی

اس روایت میں ان امور کی نشان دہی کی گئی ہے جو اسلام کو دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتے ہیں۔ یہی وہ امور ہیں جن کا اہل اسلام سے اصل کی حیثیت سے تقاضا کیا گیا ہے۔ باقی امور اخلاق اور عقل عام پر مبنی ہیں، یا دین کے وہ تقاضے ہیں جو خاص حالات میں سامنے آتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ دین کے وہ تقاضے جو حالات کے تحت سامنے آتے

---

[1] نووی رحمہ اللہ نے اس کا نام خطیب بغدادی کی کتاب ''الاسماء المبہمۃ'' کے حوالے سے یزید بن بشر سکسکی دیا ہے۔ جبکہ صاحب فتح الملہم نے بیہقی کے حوالے سے اس کا نام حکیم دیا ہے۔

ہیں، بسا اوقات اس طرح لازم ہو جاتے ہیں کہ ان سے گریز ایمان کی نفی کر دیتا ہے۔ استاد محترم جناب جاوید احمد غامدی نے اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کیا ہے:

''ایمان جب اپنی حقیقت کے اعتبار سے دل میں اترتا اور اس سے اپنی تصدیق حاصل کر لیتا ہے تو اپنے وجود ہی سے دو چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔

ایک عمل صالح

دوسرے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر

... عام حالات میں دین کے تقاضے یہی ہیں لیکن انسان کو اس کے خارج کے لحاظ سے جو حالتیں اس دنیا میں پیش آ سکتی ہیں، ان کی رعایت سے ان کے علاوہ تین تقاضے بھی اس سے پیدا ہوتے ہیں:

ایک ہجرت،

دوسرے نصرت،

تیسرے قیام بالقسط۔'' (میزان ۸۷۔۸۸)

اس سے پہلے دین کے ظاہر و باطن کی تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اسلام کا لفظ جس طرح پورے دین کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح دین کے ظاہر کو بھی بعض اوقات اسی لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اپنے اس ظاہر کے لحاظ سے یہ پانچ چیزوں سے عبارت ہے:

۱۔ اس بات کی شہادت دی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔

۲۔ نماز قائم کی جائے۔

۳۔ زکوٰۃ ادا کی جائے۔

۴۔ رمضان کے روزے رکھے جائیں۔

۵۔ بیت الحرام کا حج کیا جائے۔'' (۸۵)

استاد محترم کی پہلی بات سورۂ عصر سے ماخوذ ہے اور دوسری بات بعینہٖ حدیث جبریل میں بیان ہوئی ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان اور اسلام کے اجزا کو الگ الگ بیان کیا ہے اور اسلام کے تحت وہی امور بیان کیے ہیں جو ایک مسلمان کی روزمرہ کی زندگی میں ظاہر ہوتے ہیں۔

زیر بحث روایت کو اگر حدیث جبریل کی روشنی میں سمجھا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ دین کے مشمولات یہی ہیں۔ اب ہم ان سوالات کو زیر بحث لاتے ہیں جو اس کے معنی طے کرنے کے ضمن میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایک سوال یہ ہے کہ جب 'بنی علی' کے ساتھ بات بیان ہوئی ہے تو اس میں ایمانیات کیوں شامل نہیں کی گئیں۔ استاد محترم کی تحقیق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دین اپنے ظاہر میں انھی پانچ چیزوں پر مشتمل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بیان بھی اسی پہلو کو واضح کرتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دوسرا سوال یہ ہے کہ دین کے بہت سے دوسرے اہم احکام اس میں بیان نہیں ہوئے۔ شارحین کو سب سے زیادہ مشکل جہاد کے عدم بیان کو سمجھنے میں پیش آئی ہے۔ قرآن مجید میں جہاد کی غیر معمولی دینی اہمیت بیان ہوئی ہے اور اس میں بے عذر شرکت نہ کرنے والوں کو کہہ دیا گیا ہے کہ ان کا ایمان کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ شارحین نے اسے فرض عین اور فرض کفایہ کے فرق سے حل کیا ہے۔ یہ فرق فرد واحد کے حوالے سے ہے۔ استاد محترم کی تقسیم دین کے تقاضے کے پہلو سے ہے۔ ''میزان'' سے دیے گئے اقتباس سے واضح ہے کہ جہاد دین کے ان مطالبات میں سے ہے جو خاص حالات ہی میں سامنے آتا ہے۔ چنانچہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب دین کے ان اعمال کا ذکر کیا جائے گا جو دین میں اصلاً مطلوب ہیں تو یہی پانچ چیزیں بیان کی جائیں گی۔

بعض شارحین نے اس روایت سے یہ معنی اخذ کیے ہیں کہ یہ گھر کی تمثیل ہے۔ جس طرح گھر کسی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اسی طرح دین بھی ان امور پر قائم ہے۔ 'بــنــی' کے لفظ سے یہ معنی تو اخذ کیے جا سکتے ہیں، لیکن دوسری روایات اور خود دین کے مشمولات پر غور سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ تفسیر درست نہیں ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر یہی روایت ایک سوال کے جواب میں بھی بیان کی تھی۔ فتنے کے زمانے میں ان سے کسی نے جنگ میں شرکت کا تقاضا کیا تو انھوں نے جواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پڑھ کر سنا دیا۔ گویا ان کے نزدیک، جس نے ان امور کا اہتمام کر دیا اس نے اپنے پورے اسلام کا اظہار کر دیا۔ ابن عمر کے اس استشہاد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی روایت کو اسی معنی میں لیا ہے جو معنی ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی بات اطلاقی نہیں ہے۔ قرآن مجید سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اگر دین کو مدد کی ضرورت ہو تو اس سے گریز کا نتیجہ ایمان و عمل کے حبط کی صورت میں نکلتا ہے۔

قرآن مجید سے بھی اس روایت میں بیان کیے گئے امور کی یہی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ پہلی چیز اسلام اور کفر میں اصولی فرق کی حیثیت رکھتی ہے۔ چاروں عبادات قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ بطور واجب بیان ہوئی ہیں۔ سورۂ توبہ (۹:۵) میں قبول ایمان، نماز اور زکوٰۃ کو مسلمان ہونے کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ (۲:۱۸۳) میں روزوں کا وجوب اور آل عمران (۳:۹۷) میں حج کی فرضیت بیان ہوئی ہے۔ اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کو ایک جامع کلمے کی صورت میں بیان کر دیا ہے۔

متون

اس روایت کے متون میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ کچھ متون آپ کے سامنے ہیں۔ ان میں بھی معمولی فرق ہے۔ شہادت کا بیان جن روایات میں ہوا ہے ان میں کچھ روایات میں صرف توحید والا جز ہے۔ بعض میں دونوں ہیں لیکن

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

'رسوله' کے ساتھ 'عبده' کا لفظ نہیں ہے۔

'بني الاسلام' کی روایت تمام کتب حدیث میں 'علی خمس' یا 'خمسة' ہی کے ساتھ نقل ہوئی ہے لیکن مصنف عبدالرزاق نے اسے ثمانیہ کے عدد کے ساتھ روایت کیا ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عن حذيفة رضى الله عنه قال: بني الإسلام على ثمانية . أسهم شهادة أن لا إله إلا الله و أن محمدا رسول الله و إقام الصلوة و ايتاء الزكاة و حج البيت و صوم شهر رمضان والجهاد والأمر بالمعروف والنهي عن المنكر وقد خاب من لا سهم له. (مصنف عبدالرزاق، رقم ۵۰۱۱)

''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام کی بنا آٹھ چیزوں پر ہے۔ ان میں سے اولین اس بات کی گواہی ہے اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ نماز کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی، بیت اللہ کا حج، ماہ رمضان کے روزے، جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ جس نے ان میں کچھ نہ پایا وہ برباد ہو گیا۔''

یہ روایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی حیثیت سے نقل نہیں ہوئی۔ قرین قیاس یہی ہے کہ حضور کا قول وہی ہے جسے سب محدثین نے نقل کیا ہے اور یہ حضرت حذیفہ کا اپنا استنباط ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کے ہاں سب سے زیادہ اہمیت کن امور کو حاصل تھی۔

مسلم رحمہ اللہ کے ایک متن میں 'بني الاسلام' والا جملہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے خلفشار کے زمانے میں جنگوں میں عدم شرکت کی دلیل کے طور پر نقل ہوا ہے۔ مسند احمد کی ایک روایت میں اس کے ساتھ جہاد کے بارے میں ان کی رائے بھی نقل ہوئی ہے:

عن ابن عمر رضى الله عنه قال بني الاسلام على خمس شهادة أن لا إله إلا الله وإقام الصلاة وإيتاء الزكاة وحج البيت وصوم رمضان قال: فقال له رجل والجهاد فى سبيل الله؟ قال ابن عمر: الجهاد حسن . هكذا حدثنا رسول الله صلى الله عليه وسلم. (رقم ۴۷۹۸)

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام کی بنا پانچ چیزوں پر ہے: اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، نماز کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی، بیت اللہ کا حج اور رمضان کے روزے۔ ان سے ایک آدمی نے پوچھا: اور جہاد فی سبیل اللہ؟ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: جہاد اچھا ہے۔ حضور نے بات اتنی ہی کہی تھی۔''

ممکن ہے یہ آدمی بھی وہی ہو جس کا ایک سوال امام مسلم کی روایت میں نقل ہو گیا ہے اور دوسرا اس روایت میں بیان ہو گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کتابیات

بخاری، رقم ۸، ۹۲۸۰۔ ترمذی، رقم ۲۶۰۹۔ نسائی، رقم ۵۰۰۱۔ مسند احمد، رقم ۴۷۹۸، ۶۰۱۵، ۶۳۰۱، ۱۹۴۰، ۱۹۲۴۶۔ ابن حبان، رقم ۱۵۸، ۱۴۴۶۔ ابن خزیمہ، رقم ۳۰۸، ۳۰۹، ۱۸۸۰، ۲۵۰۵۔ سنن کبریٰ، رقم ۳۲، ۱۱۷، ۱۵۶۱۔ بیہقی، رقم ۱۵۶۱، ۱۳، ۷۰۱۳، ۷۶۸۰۔ ابویعلیٰ، رقم ۵۷۸۸، ۷۵۰۲، ۷۵۰۷۔ معجم صغیر، رقم ۷۸۲۔ معجم کبیر، رقم ۲۳۶۳ تا ۲۳۶۸، ۱۲۸۰۰، ۱۳۲۰۳، ۱۳۵۱۸۔ المسند، رقم ۷۰۳۔ مسند عبد بن حمید، رقم ۷۲۳۔ مسند شامیین، رقم ۱۳۴۷۔ معجم اوسط، رقم ۶۲۶۴، ۶۷۷۰۔ مصنف عبدالرزاق ۵۰۱۱، ۹۲۸۰۔

ساجد حمید

شرح موطا امام مالک

باب وقوت الصلوٰۃ

نماز کے اوقات

[۵] وحدثنی عن مالك عن زيد بن اسلم عن عطاء بن يسار وعن بسر بن سعيد وعن الاعرج كلهم يحدثونه عن أبی هريرة أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال:

مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصُّبْحِ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ اَدْرَكَ الصُّبْحَ وَمَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الْعَصْرِ قَبْلَ اَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ اَدْرَكَ الْعَصْرَ.

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس نے طلوع آفتاب سے پہلے ایک رکعت پوری پڑھ لی، اس نے فجر کی نماز (وقت پر) پالی۔ اور جس نے غروب آفتاب سے پہلے ایک رکعت پڑھ لی، اس نے عصر کی نماز (وقت پر) پالی۔''

شرح

مفہوم و مدعا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے تین سوالوں کے جواب مل رہے ہیں جو ان دونوں روایتوں کی مدد سے سمجھ میں

آتے ہیں، جنھیں ہم نے دیگر طرق کے عنوان کے تحت بیان کیا ہے۔

پہلا یہ کہ یہ روایت اس مسئلے کا حل بتاتی ہے کہ اگر آدمی کبھی حالات کی آپا دھاپی میں نماز میں تاخیر کر بیٹھے تو وہ کون سا آخری وقت ہے کہ جس میں وہ اگر نماز پڑھ لے تو اس کی وہ نماز ادا ہو گی۔ وہ وقت اس روایت کے مطابق یہ ہے کہ جس نے وقت کے ختم ہونے سے پہلے نماز کی ایک رکعت مکمل کر لی ہے، اس نے نماز وقت پر ادا کر لی۔

دوسرے یہ کہ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے سے روکا ہے۔ تو ایک نمازی کے ذہن میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آیا اگر وہ کسی وقت اس صورت حال کا شکار ہو کہ اس نے نماز شروع کر دی، اور ایک یا دو رکعت پڑھ کر معلوم ہوا کہ سورج طلوع ہو رہا ہے یا غروب ہو رہا ہے تو آپ نے فرمایا: اس صورت میں باقی نماز پڑھ کر اسے مکمل کرے۔ آگے آنے والی ابو ہریرہ کی روایت میں اس بات کو صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ جب کوئی ایک رکعت سورج کے طلوع یا غروب سے پہلے پا لے تو نماز مکمل کرے۔

تیسرے یہ کہ عصر کے آخری وقت کا پتا چل رہا ہے کہ وہ دو مثل سایہ نہیں، بلکہ غروب آفتاب ہے۔ اور یہی بات سنت ثابتہ کے مطابق ہے۔

لغوی مسائل

فقد ادرك الصلوٰة: تو اس نے نماز پالی۔ یہ مجاز کا اسلوب ہے اس میں نماز بول کر نماز کا وقت مراد لیا گیا ہے۔ یہ زبان کا عام اسلوب ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس نے ایک رکعت سورج ڈوبنے سے پہلے پڑھ لی تو اس نے نماز کا وقت پالیا، لیکن یہ کہنے کے بجائے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس نے نماز پالی اس لیے کہ اصل چیز نماز کا ادا ہونا تھا نہ کہ وقت کا ملنا۔ اس لیے مقصود کا ذکر کر دیا گیا۔

اس لیے یہ منطقی بحث درست نہیں ہے کہ جس نے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے پوری نماز پالی۔

درایت

قرآن وسنت سے تعلق

یہ روایت فقہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے باب سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسئلے کا جواب دیا ہے کہ اگر آدمی کو اتنی دیر ہو جائے کہ وہ نماز کے وقت کے خاتمہ کے قریب نماز پڑھے تو اس کی حد کیا ہے؟ یعنی کتنی تاخیر ہو جانے پر اس کی نماز قضا ہو جائے گی اور کب پڑھ لے تو اس کی نماز ادا ہو گی؟ آپ نے فرمایا کہ جس نے ایک رکعت پڑھنے کا وقت پالیا، اس کی نماز قضا ہونے سے بچ گئی۔

ہماری مراد یہ ہے کہ یہ بیان شریعت نہیں، بلکہ شریعت پر عمل کے دوران میں پیدا ہونے والے مسئلے کا حل ہے، جو

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فقیہانہ بصیرت سے دیا ہے۔ اس حل میں ٹھیک وہی اصول کارفرما ہے جو جماعت میں ایک رکعت پانے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملحوظ رکھا ہے۔ یعنی جس نے ایک رکعت امام کے پیچھے پالی اس نے جماعت پالی۔

یہاں ایک ضمنی سوال پیدا ہوتا ہے کہ رکعت پانے سے کیا مراد ہے۔ دوسری روایتوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بھی متعین کردی ہے کہ رکعت پانے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس رکعت کے سجود بھی طلوع آفتاب سے پہلے کرلے:

عن ابی هريرة قال: قال: رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: اذا ادرك احدكم سجدة من صلاة العصر قبل ان تغرب الشمس فليتم صلاته واذا ادرك سجدة من صلاة الصبح قبل ان تطلع الشمس فليتم صلاته. (بخاری، رقم ۵۳۱)

''ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی سورج ڈوبنے سے پہلے نماز عصر (کی پہلی رکعت) کے سجدے کر لیتا ہے، تو اسے چاہیے کہ وہ نماز مکمل کرے۔ اور جب تم میں سے کوئی طلوع آفتاب سے پہلے نماز فجر (کی پہلی رکعت) کے سجدے کر لیتا ہے، تو اسے چاہیے کہ وہ نماز مکمل کرے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سجدہ پانے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے پہلی رکعت کا قیام، رکوع اور سجدے طلوع آفتاب یا غروب آفتاب سے پہلے کر لیے ہوں۔ سادہ لفظوں میں یوں کہیے کہ اس نے پوری رکعت پڑھی ہو۔ ایک رکعت سے ہم بالعموم یہی سمجھتے ہیں کہ وہ سجدوں پر جا کر مکمل ہوتی ہے۔ اسی بات کو اس روایت میں بیان کیا گیا ہے۔

دیگر متون

مسند احمد میں یہ روایت ان الفاظ میں آئی ہے:

عن أبي هريرة أن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم قال: من صلى ركعة من صلاة الصبح قبل أن تطلع الشمس فلم تفته ومن صلى ركعة من صلاة العصر قبل أن تغرب الشمس فلم تفته. (مسند احمد، رقم ۷۴۵۱)

''ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے فجر کی ایک رکعت سورج طلوع ہونے سے پہلے پڑھ لی، تو اس کی فجر قضا نہیں ہوئی۔ اور جس نے عصر کی ایک رکعت سورج غروب ہونے سے پہلے پڑھ لی، تو اس کی عصر قضا نہیں ہوئی۔''

بخاری میں یہ روایت ان الفاظ میں آئی ہے:

عن أبي هريرة قال: قال: رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: إذا أدرك أحدكم

''ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی سورج ڈوبنے

سـجدة من صلاة العصر قبل أن تغرب الشمس فليتم صلاته، وإذا أدرك سجدة من صلاة الصبح قبل أن تطلع الشمس فليتم صلاته. (بخاری، رقم ۵۳۱)

سے پہلے نماز عصر (کی پہلی رکعت) کے سجدے کر لیتا ہے، تو اسے چاہیے کہ وہ نماز مکمل کرے۔ اور جب تم میں سے کوئی طلوع آفتاب سے پہلے نماز فجر (کی پہلی رکعت) کے سجدے کر لیتا ہے، تو اسے چاہیے کہ وہ نماز مکمل کرے۔''

یہ دونوں روایتیں موطا کی زیر بحث روایت سے درج ذیل پہلووں سے مختلف ہیں۔

مسند احمد کی روایت میں 'فلم تفته' کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ جس نے اس وقت نماز پڑھی اس کی نماز فوت نہیں ہو گی۔ یہ الفاظ موطا کے مضمون پر اضافہ ہیں۔

صحیح بخاری کی روایت میں 'ادرك سجدة' کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ رکعت پانے کا مطلب یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ سے لے کر سجدہ کرنے تک کا عمل سورج طلوع یا غروب ہونے سے پہلے کر لیا جائے۔

اسی روایت میں 'فليتم صلاته' کے الفاظ اس آدمی کے لیے تسلی کے کلمات ہیں، جو اس تردد میں تھا کہ سورج ڈوبنے اور چڑھنے کے اس ممنوع وقت میں کیا نماز کو جاری رکھے؟ یا وہ اس وقت میں نماز کا آغاز کرے، جب کہ تھوڑی دیر بعد ممنوع وقت شروع ہونے والا ہے؟ ان سوالات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے۔

احادیث باب پر نظر

امامت جبریل والی حدیث میں عصر کا آخری وقت دو مثل سایہ تک ہے، جبکہ اس میں آخری وقت غروب آفتاب کا وقت ہے، اور وہ بھی اتنا کہ آدمی ایک رکعت پا لے۔ اسی طرح اس میں فجر کا آخری وقت اسفار ہے، جبکہ اس روایت میں طلوع آفتاب سے پہلے ایک رکعت پا لینے کو آخری وقت قرار دیا گیا ہے۔ اس اختلاف پر ہم موطا کی پہلی روایت کے تحت تفصیل سے لکھ آئے ہیں۔ یہاں بس اتنا جان لیجیے کہ حدیث جبریل میں ان اوقات کا بیان ہے، جو اولوالعزم انبیا نے نمازوں کے لیے اپنائے رکھے۔ اس حدیث میں عصر اور فجر کا آخری وقت بتایا جا رہا ہے، جن کے بعد اگر آدمی نماز پڑھے تو وہ قضا ہو گی۔

فجر کی نماز کی طرح فقہا نے عصر کے وقت میں بھی اختلاف کیا ہے۔ اس میں فقہا تین گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک وہ لوگ ہیں، جنھوں نے دو مثل سایہ کے وقت کو عصر کا آخری وقت قرار دیا، دوسرے گروہ نے سورج کے زرد ہونے کو اور تیسرے گروہ نے غروب آفتاب سے پہلے ایک رکعت پڑھ سکنے کے وقت کو اس کا آخری وقت قرار دیا ہے۔ جمہور فقہا نے یہ رائے اختیار کی ہے کہ جن روایتوں میں سورج کے زرد ہونے کو آخری وقت قرار دیا گیا ہے، ان میں اور ان روایتوں میں جن میں دو مثل وقت کی بات کی گئی ہے، کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ جو روایت غروب آفتاب سے ایک رکعت پہلے تک کے وقت والی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے، وہ صاحب عذر اور مجبور کا وقت ہے نہ کہ عام حالات کا وقت۔

ہمارے خیال میں ان سب روایتوں کی تاویل سنت ثابتہ کی روشنی میں ہونی چاہیے۔ پچھلی روایتوں میں ہم تفصیل سے اس موضوع پر بات کر آئے ہیں۔ سنت ثابتہ میں نمازوں کے اوقات ان کے ناموں کے ذریعے سے متعین کیے گئے ہیں۔ یہی معاملہ نماز عصر کا ہے۔ امامت جبریل ''دومثل سائے'' اور ''سورج کے زرد ہونے تک'' والی تمام روایتیں دراصل متعین کردہ وقت کے بارے میں کچھ بیان نہیں کر رہی ہیں، بلکہ یہ روایتیں نماز عصر کے پسندیدہ وقت کا تعین کر رہی ہیں۔ اسی رائے سے تمام روایات اپنی اپنی جگہ قائم رہتے ہوئے بھی باہم متعارض نہیں رہتیں۔

ٹھیک یہی حل فجر کی نماز کا ہے جسے ہم پچھلی روایت کے تحت تفصیل سے لکھ آئے ہیں۔ ہمارا وہ استدلال جو فجر کے بارے میں ہے وہی یہاں عصر کے بارے میں ملحوظ رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ فجر اور عصر کا معاملہ روایتوں میں بالکل ایک جیسا ہے۔ پچھلی روایت میں اور موطا کی پہلی روایت میں ہمارا سارا استدلال بیان ہو گیا ہے۔ اس لیے یہاں طول کلام کی ضرورت نہیں ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

اخلاقیات

(۱)

ایمان کے بعد دین کا اہم ترین مطالبہ تزکیۂ اخلاق ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان خلق اور خالق، دونوں سے متعلق اپنے عمل کو پاکیزہ بنائے۔ یہی وہ چیز ہے جسے عمل صالح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تمام شریعت اسی کی فرع ہے۔ تمدن کی تبدیلی کے ساتھ شریعت تو، بے شک تبدیل بھی ہوئی ہے، لیکن ایمان اور عمل صالح اصل دین ہیں۔ ان میں کوئی ترمیم و تغیر کبھی نہیں ہوا۔ قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ جو شخص ان دونوں کے ساتھ اللہ کے حضور میں آئے گا، اس کے لیے جنت ہے اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا، قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ، فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى، جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا، وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى. (طٰہٰ ۲۰: ۷۵-۷۶)

''اور جو اُس کے حضور مومن ہو کر آئیں گے، جنھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے، وہی ہیں جن کے لیے اونچے درجے ہوں گے، سدا بہار باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہ صلہ ہے اُن کا جو پاکیزگی اختیار کریں۔''

یہی عمل صالح ہے جسے فضائل اخلاق سے، اور اس کے مقابل میں غیر صالح اعمال کو اس کے رذائل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: 'انما بعثت لأتمم مکارم الاخلاق'[۱] میں اخلاق عالیہ کو اس کے اتمام تک پہنچانے کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔ نیز فرمایا ہے کہ تم میں سے بہترین لوگ وہی ہیں جو اپنے اخلاق میں دوسروں سے اچھے

[۱] الاحادیث الصحیحہ، البانی، رقم ۴۵۔

ہیں[2]۔ یہی لوگ مجھے سب سے زیادہ محبوب بھی ہیں[3]۔ قیامت کے دن آدمی کی میزان میں سب سے زیادہ بھاری چیز اچھے اخلاق ہی ہوں گے[4] اور بندۂ مومن وہی درجہ حسن اخلاق سے حاصل کر لیتا ہے جو کسی شخص کو دن کے روزوں اور رات کی نمازوں سے حاصل ہوتا ہے[5]۔

بنیادی مباحث

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا، فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا، قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا، وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا. (الشمس ۹۱: ۷-۱۰)

''اور نفس گواہی دیتا ہے، اور جیسا اُسے سنوارا، پھر اُس کی نیکی اور بدی اُسے سجھا دی کہ مراد کو پہنچ گیا وہ جس نے اُس کو پاک کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے آلودہ کیا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

انسان کے پاس خیر و شر کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟ یہ فلسفۂ اخلاق کا سب سے بنیادی سوال ہے۔ قرآن نے ان آیتوں میں واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو دیکھنے کے لیے آنکھیں اور سننے کے لیے کان دیے ہیں، بالکل اسی طرح نیکی اور بدی کو الگ الگ پہچاننے کے لیے ایک حاسۂ اخلاقی بھی عطا فرمایا ہے۔ وہ محض ایک حیوانی اور عقلی وجود ہی نہیں ہے، اس کے ساتھ ایک اخلاقی وجود بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خیر و شر کا امتیاز اور خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اس کے دل و دماغ میں الہام کر دیا گیا ہے۔ بعض دوسرے مقامات پر یہی حقیقت 'انا ھدینٰہ السبیل[6]' (ہم نے اسے خیر و شر کی راہ سجھا دی) اور 'ھدینٰہ النجدین[7]' (ہم نے کیا اسے دونوں راستے نہیں سجھائے) کے الفاظ میں واضح کی گئی ہے۔ یہ امتیاز و احساس ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ چنانچہ برے سے برا آدمی بھی گناہ کرتا ہے تو پہلے مرحلے میں اسے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دینے کے بعد اس کی

۲؎ بخاری، رقم ۵۶۸۲۔ مسلم، رقم ۲۳۲۱۔

۳؎ بخاری، رقم ۳۵۴۹۔

۴؎ ابوداؤد، رقم ۴۷۹۹۔ ترمذی، رقم ۲۰۰۲۔

۵؎ ابوداؤد، رقم ۴۷۹۸۔ ترمذی، رقم ۲۰۰۳۔

۶؎ الدہر ۷۶: ۳۔

۷؎ البلد ۹۰: ۱۰۔

لاش چھپانے کی کوشش کی تھی تو ظاہر ہے کہ احساس گناہ ہی کی وجہ سے کی تھی۔ یہی معاملہ نیکی کا ہے۔ انسان اس سے محبت کرتا ہے، اس کے لیے اپنے اندر عزت واحترام کے جذبات پاتا ہے اور اپنے لیے جب بھی کوئی معاشرت پیدا کرتا ہے، اس میں حق وانصاف کے لیے لازماً کوئی نظام قائم کرتا ہے۔ یہ اس امتیاز خیر وشر کے فطری ہونے کا صریح ثبوت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ برائی کے حق میں انسان بعض اوقات بہانے بھی تراش لیتا ہے، لیکن جس وقت تراشتا ہے، اسی وقت جانتا ہے کہ یہ بہانے وہ اپنی فطرت کے خلاف تراش رہا ہے۔ اس لیے کہ وہی برائی اگر کوئی دوسرا اس کے ساتھ کر بیٹھے تو بغیر کسی تردد کے وہ اسے برائی ٹھیراتا اور اس کے خلاف سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: نیکی حسن اخلاق ہے اور گناہ وہ ہے جو تمھارے دل میں کھٹک پیدا کر دے اور تم یہ پسند نہ کرو کہ دوسرے لوگ اسے جانیں[۸]۔ نفس انسانی کا یہی پہلو ہے جسے قرآن نے نفس لوامہ[۹] سے تعبیر کیا ہے اور پھر پوری صراحت کے ساتھ فرمایا ہے:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ، وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ. (القیامہ ۷۵: ۱۴۔۱۵)

''بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) انسان خود اپنے اوپر گواہ ہے، اگرچہ کتنے ہی بہانے بنائے۔''

اس الہام کی تعبیر میں، البتہ اشخاص، زمانے اور حالات کے لحاظ سے بہت کچھ اختلافات ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس کی گنجایش بھی اس نے باقی نہیں رہنے دی اور جہاں کسی بڑے اختلاف کا اندیشہ تھا، اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے خیر وشر کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ ان پیغمبروں کی ہدایت اب قیامت تک کے لیے قرآن مجید میں محفوظ ہے۔ انسان اپنے اندر جو کچھ پاتا ہے، یہ ہدایت اس کی تصدیق کرتی ہے اور انسان کا وجدانی علم، بلکہ تجربی علم، قوانین حیات اور حالات وجود سے استنباط کیا ہوا علم اور عقلی علم، سب اس کی گواہی دیتے ہیں۔ چنانچہ اخلاق کے فضائل ورذائل اس کے نتیجے میں پوری قطعیت کے ساتھ متعین ہو جاتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

روایتوں میں ایک تمثیل کے ذریعے سے یہی بات اس طرح سمجھائی گئی ہے کہ تم جس منزل تک پہنچنا چاہتے ہو، اس کے لیے ایک سیدھا راستہ تمھارے سامنے ہے جس کے دونوں طرف دو دیواریں کھنچی ہوئی ہیں۔ دونوں میں دروازے کھلے ہیں جن پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ راستے کے سرے پر ایک پکارنے والا پکار رہا ہے کہ اندر آ جاؤ اور سیدھے چلتے رہو۔ اس کے باوجود کوئی شخص اگر دائیں بائیں کے دروازوں کا پردہ اٹھانا چاہے تو اوپر سے ایک منادی پکار کر کہتا ہے: خبردار، پردہ نہ اٹھانا۔ اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے۔ فرمایا ہے کہ یہ راستہ اسلام ہے، دیواریں اللہ کے حدود ہیں، دروازے اس کی قائم کردہ حرمتیں ہیں، اوپر سے پکارنے والا منادی خدا کا وہ واعظ ہے جو ہر بندۂ مومن کے دل میں ہے اور راستے کے سرے پر پکارنے

۸؎ مسلم، رقم ۲۵۵۳۔

۹؎ القیامہ ۷۵: ۲۔

ولا قرآن نے[101]:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ، وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ، اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۹)

''بے شک، یہ قرآن اُس راستے کی رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے اور اپنے ماننے والوں کو جو اچھے عمل کرتے ہیں اس بات کی بشارت دیتا ہے کہ اُن کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

[باقی]

۱۰۱؎ ترمذی، رقم ۲۸۵۹۔ احمد، رقم ۱۷۶۷۱۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

منظور الحسن

اسلام اور مصوری

جاوید احمد غامدی کا نقطۂ نظر

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

انسان کو اللہ تعالیٰ نے احسن تقویم پر پیدا کیا ہے۔ چنانچہ فکر و عمل میں حسن و خوبی کی جستجو اس کی خلقت کا لازمی تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شر کے مقابلے میں خیر کا طالب اور سیئات کے برعکس حسنات کا تمنائی ہے۔ وہ نفرت، جھوٹ، ظلم اور بے انصافی کے بجائے اخلاص و محبت، صدق و صفا اور عدل و انصاف کا داعی اور ظلمت کے بجائے نور، تعفن کے بجائے خوش بو اور بدنمائی کے بجائے رعنائی کا مشتاق ہے۔ تہذیب و تمدن کا ارتقا درحقیقت حسن و خوبی کی جستجو ہی کی داستان ہے۔ اس کا لفظ لفظ بتا رہا ہے کہ انسان نے ہمیشہ بہترین کا انتخاب کیا ہے۔ نشو و نما کے لیے اسے غذا کی ضرورت تھی۔ وہ اسے خار و خس اور ساگ پات سے بھی پورا کر سکتا تھا، مگر اس نے انواع و اقسام کے خوش ذائقہ کھانوں کو دستر خوان پر سجایا۔ ستر پوشی اس کی حیا کا تقاضا تھا، یہ بوریا اوڑھ کر اور ٹاٹ لپیٹ کر بھی پورا ہو سکتا تھا، مگر اس نے ریشم و دیبا اور اطلس و کم خواب کا انتخاب کیا۔ رہنے بسنے کے لیے اسے مسکن درکار تھا، اس کا بندوبست جنگلوں اور صحراؤں میں غاروں، خیموں اور جھونپڑیوں کی صورت میں بھی ہو سکتا تھا، مگر اس نے شہر آباد کیے اور ان میں عالی شان محلات آراستہ کیے۔ میل جول میں اسے ابلاغ مدعا کی ضرورت تھی۔ یہ اشاروں سے نہ سہی تو سادہ بول چال سے بھی کیا جا سکتا تھا، مگر اس نے کلام کے ایسے اسالیب وضع کیے کہ زبان شعر و ادب کے قالب میں ڈھل گئی۔

انسان کی اس تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے ہر اقدام میں حسن و خوبی

کا خوگر ہے۔اس کی ظاہری و باطنی حسیات اوران کے لوازم اس کے ذوق جمال کے آئینہ دار ہیں۔ چنانچہ یہ اس کا حسن بیان ہے کہ وہ لفظوں کو مرتب کرتا اوران کے آہنگ اور معانی کی تاثیر سے اشعار تخلیق کرتا ہے، یہ اس کا حسن صوت ہے کہ وہ آواز میں درد وسوز اور لحن وغنا پیدا کرتا اوراس کے زیر و بم سے راگ اور سر ترتیب دیتا ہے، یہ اس کا حسن سماعت ہے کہ وہ اپنے ماحول کی آوازوں سے مسحور ہوتا اور انھیں محفوظ کرنے کے لیے ساز تشکیل دیتا ہے اور یہ اس کا حسن نظر ہے کہ وہ قدرت کی رعنائیوں سے مسرور ہوتا، گرد وپیش کی تزیین و آرایش کرتا اور رفتہ کی یادگاروں، حاضر کے نظاروں اور آیندہ کے تصورات کو تصویروں میں ڈھالتا ہے۔حسن بیان، حسن صوت، حسن سماعت اور حسن نظر کی صورت میں انسان کا یہی ذوق جمالیات جب اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو فن کا مقام حاصل کرتا ہے اور شاعری، موسیقی اور مصوری سے موسوم ہوتا ہے۔شعروادب، ساز وسرود اور تصویر و تمثیل سے متعلق انھی فنون کے مجموعے کا عنوان فنون لطیفہ ہے۔ یہ انسان کی نفسی تسکین کا باعث بنتے اور اس کے جمالیاتی وجود کے لیے حظ ونشاط کا سامان کرتے ہیں۔

فنون لطیفہ مباحات فطرت میں سے ہیں، اس لیے ان کی اباحت میں کوئی شبہ نہیں ہے، مگر ان میں سے موسیقی اور مصوری کے بارے میں بالعموم یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اسلامی شریعت انھیں حرام قرار دیتی ہے۔ ہمارے نزدیک اس تصور کے لیے شریعت میں کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔دین میں کسی چیز کے جواز یا عدم جواز کے لیے فیصلہ کن حیثیت قرآن وسنت کو حاصل ہے۔ان کی سند کے بغیر شریعت کی فہرست حلت وحرمت میں کوئی ترمیم واضافہ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ایمان کا تقاضا ہے کہ جن امور کو یہ جائز قرار دیں، انھیں پورے شرح صدر کے ساتھ جائز تصور کیا جائے اور جنھیں ناجائز قرار دیں، فکر وعمل کے میدان میں ان کے جواز کی کوئی راہ ہرگز نہ ڈھونڈی جائے۔

دین کے مصادر میں فن مصوری کے مختلف مظاہر کا ذکر مثبت اسلوب میں آیا ہے۔قرآن مجید میں اللہ کے ایک برگزیدہ نبی سیدنا سلیمان علیہ السلام کے تصویریں اور مجسمے بنوانے کا تذکرہ ہے۔ بائیبل میں انھی جلیل القدر پیغمبر کے حوالے سے بیان ہوا ہے کہ انھوں نے اپنے گھر اور اللہ کی عبادت گاہ کو تصویروں اور مجسموں سے مزین کیا تھا۔حدیث کی کتابوں میں نقل ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فن کی بعض

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مصنوعات سے بالعموم گریز فرمایا، تاہم عام لوگوں کے لیے آپ نے ان کے استعمال پر اصلاً کوئی پابندی نہیں لگائی۔ ان روایتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے گریز کا سبب آپ کا طبعی میلان اور منصب نبوت کی ذمہ داریاں تھیں۔

ان ماخذ میں فن مصوری کی بعض اصناف کی شناعت بھی مذکور ہے، مگر اس کا تعلق سر تا سر مشرکانہ تماثیل و تصاویر سے ہے۔ قرآن مجید نے پوجی جانے والی تماثیل ہی کی مذمت فرمائی ہے، بائیبل میں ایسی مورتیں بنانے سے منع کیا گیا ہے جن کی پرستش کی جاتی تھی اور احادیث میں بھی معبود ٹھہرائے جانے والے مجسموں اور ان کی تصویروں اور شبیہوں کو مذموم قرار دیا گیا ہے اور انھیں بنانے والے مصوروں کے بارے میں اخروی عذاب کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس بنا پر یہ بات نہایت اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ تماثیل و تصاویر کی یہ شناعت علی الاطلاق نہیں، بلکہ اس کے بعض مظاہر کے شرک سے متعلق ہونے کی وجہ سے ہے۔

اس ضمن میں ہمارے بیش تر علما اور فقہا کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جان دار مخلوقات کی تصاویر حرام اور بے جان کی جائز ہیں۔ اس کی اساس ان کے نزدیک وہ روایات ہیں جن میں اللہ کی مخلوق کے مشابہ مخلوق بنانے کی مذمت کی گئی ہے اور ایسی تصویریں اور مجسمے بنانے سے منع کیا گیا ہے جن میں روح پائی جاتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نقطۂ نظر مذکورہ روایتوں کے صحیح فہم پر مبنی نہیں ہے۔ ان روایتوں کو اگر دیگر روایات اور تاریخی پس منظر کی روشنی میں سمجھا جائے تو یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ممانعت صرف اور صرف مشرکانہ تصویروں کے ضمن میں ہے۔ مشرکین عرب بعض مخصوص مجسموں میں فرشتوں، جنوں اور انسانوں کی روحوں کے حلول کے قائل تھے اور انھیں حی و قیوم اور نافع و ضار سمجھ کر ان کی پرستش کرتے تھے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مجسموں کو اور ان کی شبیہ پر بننے والی تصویروں کو اللہ کی مخلوق جیسی مخلوق بنانے سے تعبیر کیا اور انھیں بنانے اور گھروں میں رکھنے سے منع فرمایا۔

اس تناظر میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دیگر فنون لطیفہ کی طرح فن مصوری بھی مباحات فطرت میں سے ہے۔ اسلامی شریعت نے اس کی فطری اباحت کی تائید کی ہے اور اس کی حرمت و شناعت کا کوئی حکم صادر نہیں کیا۔ چنانچہ مجسمہ سازی، تصویر کشی، کندہ کاری، نقاشی اور اس نوع کے دیگر فنون مصوری بجا طور پر استعمال کیے جا سکتے اور تہذیب و تمدن کے ارتقا میں ان کی صنعتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جہاں تک قرآن، بائیبل اور احادیث میں مذکور ان کے بعض مظاہر کی شناعت کا تعلق ہے تو اس کا سبب ان کا مشرکانہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مراسم کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ کسی صنف کو اگر لوگ غیر دینی اور غیر اخلاقی مقاصد کے لیے استعمال کریں گے تو اسے لازماً شنیع قرار دیا جائے گا، مگر ظاہر ہے کہ یہ شناعت اس صنف سے نہیں، بلکہ دینی و اخلاقی مفاسد سے متعلق ہوگی۔ یہ مفاسد جب تک اس صنف کے ساتھ وابستہ رہیں گے، شناعت قائم رہے گی اور جب منفک ہو جائیں گے تو شناعت بھی ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ مصوری کے مظاہر کی حرمت و اباحت کا تعلق ان کے جان دار اور بے جان یا حیوان اور غیر حیوان ہونے سے نہیں ہے۔ اس کا تعلق اصلاً دینی و اخلاقی عوارض سے ہے۔ یہ عوارض اگر کسی شبیہ یا تصویر میں موجود ہیں تو وہ جان دار کی ہے یا بے جان کی، بہرصورت شنیع قرار پائے گی اور اگر وہ ان سے خالی ہے تو شجر و حجر کی ہے یا انسان و حیوان کی، ہر حال میں مباح ہوگی۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قرآن مجید اور مصوری

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ. يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ. (السبا ۳۴: ۱۲۔۱۳)

''اور ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا۔ اس کا جانا بھی مہینا بھر کا ہوتا اور آنا بھی مہینا بھر کا ہوتا اور ہم نے اس کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور جنات میں سے بھی اس کے لیے مسخر کر دیے جو اس کے رب کے حکم سے اس کے حضور میں خدمت کرتے (اور ان کے لیے ہمارا حکم یہ تھا کہ) جو ان میں سے ہمارے حکم کی سرتابی کرے گا تو ہم اس کو دوزخ کا عذاب چکھائیں گے۔ وہ اس کے لیے بناتے جو وہ چاہتا: محرابیں، تماثیل، حوضوں کے مانند لگن اور لنگر انداز دیگیں ـــــ اے آل داؤد، شکر گزاری کے ساتھ عمل کرو اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی ہیں۔''

سورۂ سبا کے اس مقام پر ان انعامات کا ذکر ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سیدنا سلیمان علیہ السلام کو عطا فرمائے تھے۔ ان میں سے ایک انعام یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض جنات کو سیدنا سلیمان علیہ السلام کے لیے مسخر کر دیا تھا۔ وہ آپ کے تابع فرمان تھے اور آپ کی خواہش کے مطابق مختلف خدمات انجام دیتے تھے۔ آپ نے انھیں جن کاموں پر مامور فرمایا، ان میں سے ایک کام یہ بھی تھا کہ وہ

آپ کے لیے تماثیل یعنی تصویریں اور مجسمے بناتے تھے[1]۔

سورۂ سبا کی ان آیات سے مصوری کے بارے میں حسب ذیل باتوں کی وضاحت ہوتی ہے:

اولاً، اللہ کے ایک برگزیدہ پیغمبر نے اپنے تابع فرمان جنوں سے تصویریں اور مجسمے بنوائے۔ پیغمبر چونکہ اللہ کی براہ راست رہنمائی میں زندگی بسر کرتا ہے، اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ اس سے شعوری طور پر کوئی غیر مباح عمل صادر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کا یہ عمل تصویر کی اباحت پر دلیل قاطع ہے۔

ثانیاً، سیدنا سلیمان علیہ السلام کے اس عمل کا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے۔ یہ کتاب برحق ہے۔ یہ اگر کسی واقعے کی تصدیق کر دے تو اس کے بارے میں شک وشبہے کا ہر احتمال ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا مذکورہ واقعے کو بیان کر دینا ہی اس کی صحت کی دلیل ہے۔ مزید براں قرآن کے اس ذکر سے ان تفصیلات کی بھی تصدیق ہوتی ہے جو سیدنا سلیمان علیہ السلام کے تعمیر کردہ ہیکل اور محل میں تصویروں اور مجسموں کے حوالے سے تورات میں بیان ہوئی ہیں[2]۔

ثالثاً، ان آیات میں تماثیل کے ساتھ یکساں طور پر محرابیں، حوضوں کے مانند لگن اور لنگر انداز دیگیں بنانے کا ذکر ہوا ہے۔ اس یکساں ذکر کی وجہ سے مذکورہ چار چیزوں پر باہم مختلف حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں فلاں چیز جائز ہے اور فلاں ناجائز ہے۔ جواز کا حکم لگانا ہے تو سبھی پر لگے گا اور عدم جواز کے حکم کا اطلاق کرنا ہے تو سبھی پر ہوگا۔ چنانچہ یہاں اگر محرابوں، لگنوں اور دیگوں کے جواز کا حکم مستنبط ہوتا ہے تو تماثیل کو اس حکم سے ہرگز خارج نہیں کیا جا سکتا۔

رابعاً، تماثیل کا لفظ حیوان اور غیر حیوان، دونوں کی تصویروں اور مجسموں پر محیط ہے۔ اس مفہوم کی بنا پر یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ جب یہ لفظ مجرد طور پر استعمال ہو تو اس کے مفہوم سے حیوانات کی تصویروں کو ہرگز خارج نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں یہ لفظ کسی تخصیص کے بغیر استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ قرین قیاس یہی ہے کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے حیوان اور غیر حیوان، دونوں طرح کی مخلوقات کی تصویریں

---

[1] 'تماثیل' 'تمثال' کی جمع ہے۔ یہ لفظ حیوانات اور جمادات ونباتات کی صورت میں تمام مخلوقات کی تصویروں اور مجسموں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

[2] تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویریں اور مجسمے حیوان اور غیر حیوان، دونوں طرح کی مخلوقات کے تھے اور سیدنا سلیمان علیہ السلام نے انھیں ہیکل اور اپنے محل کی تعمیر کے موقع پر بنوایا تھا۔ (سلاطین ۱۸: ۳۰، ۲۷: ۳۰)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اور مجسمے بنوائے تھے۔

خامساً، آیت کے اختتام پر ''اے آل داؤد، شکر گزاری کے ساتھ عمل کرو'' کے الفاظ سے واضح ہے کہ مذکورہ چیزیں انعامات ہی کی نوعیت کی تھیں۔ اللہ کی شکر گزاری اس کے فضل و انعام ہی سے مستلزم ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی آیت کے ان الفاظ کے تحت لکھتے ہیں:

''یہ اس فضل و انعام کا حق بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر فرمایا۔ ان کو ہدایت ہوئی کہ اس علم و سائنس اور ان ارضی و سماوی برکات کو پا کر بہک نہ جانا، بلکہ اپنے رب کی شکر گزاری کے ساتھ ہر چیز اس کے صحیح محل میں برتنا اور ہر قدم صحیح سمت میں اٹھانا۔ یہ نصیحت یوں تو اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت زبان حال سے بھی کرتی ہے، لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام پیغمبر تھے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے بھی ان کو ہدایت فرمائی۔'' (تدبر قرآن ۶/۳۰۵)

سادساً، قرآن مجید نے اس موقع پر تماثیل کی حرمت و شناعت کا کوئی اشارہ نہیں دیا۔ چنانچہ یہ رائے صحیح نہیں ہے کہ یہ سابقہ شریعتوں میں جائز اور اسلامی شریعت میں ناجائز ہیں۔ اگر یہ بات درست ہوتی تو قرآن اسی مقام پر یا کسی دوسرے مقام پر شریعت کی اس تبدیلی کو ضرور بیان کرتا۔

ان نکات کی بنا پر یہ بات نہایت اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ قرآن مجید سے مصوری کی اباحت ہی معلوم ہوتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بائیبل اور مصوری

بائیبل میں مختلف مقامات پر بنی اسرائیل کی عبادت گاہ ہیکل سلیمانی اور سیدنا سلیمان علیہ السلام کے محل کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تعمیر کے موقع پر سیدنا سلیمان علیہ السلام نے تزئین و آرایش کے لیے ان میں مجسمے اور تصویریں بنوائیں۔ یہ مجسمے اور تصویریں فرشتوں، حیوانوں، درختوں اور پھولوں کی تھیں۔

سلاطین میں ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ کے گھر ہیکل کو تعمیر کرایا تو اس میں فرشتوں اور بعض حیوانوں کی تصویریں، مجسمے اور کندہ کی ہوئی صورتیں بنوائیں:

> ''اور الہام گاہ میں اس نے زیتون کی لکڑی کے دو کروبی دس دس ہاتھ اونچے بنائے... دونوں کروبی ایک ہی ناپ اور ایک ہی صورت کے تھے... اور اس نے اس گھر کی سب دیواروں پر گرداگرد اندر اور باہر کروبیوں اور کھجور کے درختوں اور کھلے ہوئے پھولوں کی کھدی ہوئی صورتیں کندہ کیں۔'' (۶: ۲۳، ۲۵، ۲۹)

سلاطین ہی میں ہے کہ ہیکل کی تعمیر کے بعد سیدنا سلیمان علیہ السلام نے اپنا محل تعمیر کرایا اور اس میں رکھی جانے والی کرسیوں پر بھی تماثیل بنوائیں:

> ''اس نے پیتل کی دس کرسیاں بنائیں... اور ان کرسیوں کی کاری گری اس طرح کی تھی۔ ان کے حاشیے تھے اور پڑوں کے درمیان بھی حاشیے تھے۔ اور ان حاشیوں پر جو پڑوں کے درمیان تھے، شیر اور بیل اور کروبی بنے تھے۔'' (۷: ۲۷، ۲۸)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بائیبل میں حزقی ایل نبی کے ہیکل سلیمانی کے مشاہدے کا واقعہ نقل ہوا ہے۔ اس میں بیان ہوا ہے کہ حزقی ایل نبی نے ہیکل میں کھجور کے درختوں اور فرشتوں کی تصویروں کا نظارہ کیا:

''اور (وہاں) کروبی اور کھجور بنے تھے اور ایک کھجور دو کروبیوں کے بیچ میں تھا اور ہر ایک کروبی کے دو چہرے تھے۔ چنانچہ ایک طرف انسان کا چہرہ کھجور کی طرف تھا اور دوسری طرف جوان شیر ببر کا چہرہ بھی کھجور کی طرف تھا۔ گھر کی چاروں طرف اسی طرح کا کام تھا۔ زمین سے دروازہ کے اوپر تک اور ہیکل کی دیوار پر کروبی اور کھجور بنے تھے۔'' (حزقی ایل ۴۱: ۱۹۔ ۲۱)

بائیبل کے درج بالا مندرجات سے ان باتوں کی صراحت ہوتی ہے:

ایک یہ کہ اللہ کے گھر اور پیغمبر کے گھر، دونوں کو مختلف تصویروں اور مجسموں سے مزین کیا گیا تھا۔ بنی اسرائیل کے لیے ہیکل کی حیثیت خانۂ خدا کی تھی اور شاہی محل کی حیثیت سیدنا سلیمان علیہ السلام کی قیام گاہ کی تھی۔ ان مقامات پر تصویروں کی موجودگی کے معنی یہ ہیں کہ گویا پیغمبر کے حین حیات بنی اسرائیل کے ہاں بیت اللہ اور بیت النبی، دونوں میں تصویریں موجود تھیں۔

دوسرے یہ کہ تصویروں اور مجسموں کے ذریعے سے تزئین و آرایش کا یہ کام خود اللہ کے پیغمبر سیدنا سلیمان علیہ السلام کے حکم سے اور آپ کی براہ راست رہنمائی میں ہوا تھا۔

تیسرے یہ کہ ان تصویروں میں کھجور کے درختوں اور پھولوں جیسی بے جان چیزوں کی تصویریں بھی تھیں اور فرشتوں اور حیوانوں جیسی جان دار مخلوقات کی تصویریں بھی شامل تھیں۔

ان باتوں سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ انبیاے بنی اسرائیل کی شریعت میں مصوری نہ صرف جائز تھی، بلکہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کے عہد میں اسے ایک قابل قدر فن کی حیثیت بھی حاصل تھی اور نقاشی، کندہ کاری اور مجسمہ سازی جیسے فنون کو تعمیر اور تزئین کے موقعوں پر نہایت دل چسپی کے ساتھ استعمال کیا جاتا تھا۔[۳]

۳؎ بائیبل کے مذکورہ مقامات کے بارے میں یہ سوال ہوسکتا تھا کہ کیا یہ من جملۂ تحریفات تو نہیں ہیں، مگر قرآن مجید نے سورۂ سبا (۳۴) میں سیدنا سلیمان علیہ السلام کی بابت تماثیل کا حوالہ دے کر ان کی صحت کی تصدیق کر دی ہے۔ اس تصدیق کے بعد ان کی حیثیت سچے واقعات کی ہے اور اسی بنا پر یہ مصوری کے جواز کے لیے نصوص کا درجہ رکھتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

احادیث اور مصوری

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مصوری عرب معاشرت کا حصہ تھی۔تزئین و آرایش کے لیے بالعموم اسی فن کو استعمال میں لایا جاتا تھا۔ لوگ اپنے گھروں کی زیب و زینت کے لیے دیواروں اور ستونوں کو تصویروں سے مزین کرتے، طاقوں اور دروازوں پر منقش پردے سجاتے اور نشست گاہوں میں تصویروں والے غالیچے اور تکیے آراستہ کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طبعی میلان اور منصبی ذمہ داریوں کے پیش نظر اگرچہ اس فن کے مختلف جمالیاتی اور آرایشی مظاہر سے رغبت کا اظہار نہیں فرمایا، تاہم عام لوگوں کے لیے آپ نے ان کے استعمال پر اصلاً کوئی قدغن نہیں لگائی۔ مزید براں کھلونوں کی صورت میں اس فن کی مختلف مصنوعات کے بارے میں آپ نے جس طرز عمل کا اظہار کیا، اس سے بھی اس کے جواز ہی کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ اس بنا پر یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مصوری اور اس نوع کے دیگر فنون کی فطری اباحت کو ہر لحاظ سے قائم رکھا ہے۔ ذیل میں اسی پہلو سے چند نمائندہ روایتیں نقل کی گئی ہیں۔

پردے پر تصویر

عن عائشة قالت كان لنا ستر فيه تمثال طائر و كان الداخل اذا دخل استقبله فقال لى رسول الله صلى الله عليه و سلم حولى هذا فانى كلما دخلت فرايته ذكرت الدنيا ... فلم يامرنا رسول الله صلى الله عليه

و سلم بقطعه. (مسلم، رقم ۲۱۰۷)

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ہمارے ہاں (گھر کے دروازے پر) ایک پردہ (لٹکا ہوا) تھا جس پر پرندے کی تصویر تھی۔ گھر میں داخل ہونے والا کوئی شخص جب داخل ہوتا تو اس (پردے) کو اپنے سامنے پاتا۔ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی جب گھر میں آتے تو آپ کی نظر اس پر پڑتی)۔ پھر (ایک موقع پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: اس (پردے) کو (یہاں سے) ہٹا دو، میں جب بھی گھر داخل ہوتے ہوئے اسے دیکھتا ہوں تو مجھے دنیا یاد آ جاتی ہے... (سیدہ فرماتی ہیں کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اسے (ہٹانے ہی کا حکم دیا) پھاڑ دینے کا حکم نہیں دیا۔''

اس روایت سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

o نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے دروازے پر پردہ لٹکا ہوا تھا جس پر تصویر بنی ہوئی تھی۔

o یہ تصویر کسی پرندے کی تھی۔

o پردہ چونکہ دروازے پر لٹکا ہوا تھا، اس لیے گھر میں داخل ہونے والے ہر شخص کی نظر اس پر پڑتی تھی۔

o یہ پردہ کچھ روز تک لٹکا رہا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سے گزرتے رہے[۴]۔

o بالآخر ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عائشہ کو اسے ہٹانے کا حکم دیا۔

o پردے کو ہٹانے کا سبب بیان کرتے ہوئے آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اس کو دیکھنے سے مجھے دنیا یاد آ جاتی ہے۔

o روایت میں یہ مزید وضاحت کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پردے کو پھاڑنے اور اس پر منقش تصویر کو قطع کرنے کا حکم نہیں دیا۔

اس روایت سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تصویر کو ناجائز نہیں سمجھتے تھے۔ روایت کے حسب ذیل پہلوؤں سے اسی بات کی تصدیق ہوتی ہے:

اولاً، تصویر اگر ناجائز ہوتی تو یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خانہ کے ہاں معلوم و معروف ہوتی اور کوئی شخص بیت النبی پر تصویر والا پردہ لٹکانے کی جسارت نہ کرتا۔

---

[۴] 'کلما دخلت فرایته'، ''میں جب بھی گھر داخل ہوتے ہوئے اسے دیکھتا ہوں'' کے الفاظ سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ثانیاً، اگر ایسا ہو بھی جاتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلی نظر ہی میں پردہ اتروا دیتے اور اس میں سے ایک سے زائد بار گزرنا گوارا نہ کرتے۔

ثالثاً، آپ اپنے حکم کو پردہ اتارنے تک ہی محدود نہ رکھتے، بلکہ اسے قطع بھی کرا دیتے تاکہ تصویر باقی نہ رہے۔

اس توضیح سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر کو ممنوع یا غیر مباح قرار نہیں دیا اور نہ اسے کسی حرام شے سے وابستہ کیا ہے، بلکہ اس کے برعکس تصویر والے پردے کو دنیا سے متعلق کر کے تصویر کی اباحت کی تصدیق فرما دی ہے۔[5]

یہاں یہ واضح رہے کہ پردے پر تصویر کا نقش درحقیقت اس کے مزین ہونے کی علامت ہے۔ عربوں کے ہاں گھروں کی آرایش و زیبایش کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ لوگ انسانوں اور حیوانوں کی تصویروں والے منقش پارچہ جات کو دیواروں، طاقوں اور دروازوں پر آویزاں کرتے تھے۔ ''المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام'' میں ڈاکٹر جواد علی لکھتے ہیں:

بعض اهل مكة وسائر مواضع الحجاز الأخرى، كانوا يضعون الصور والتماثيل في بيوتهم... وأن طائفة من النساجين والخياطين كانوا يجعلون صور انسان او حيوان على الستائر أو الملابس لتزويقها ... اهل الجاهلية كانوا يزينون بيوتهم بالصور وبالنسيج المصور، كما كانوا يستعملون ستائر ذات صور. (۸/۸۳،۸۸)	''بعض اہل مکہ اور حجاز کے دوسرے تمام علاقوں کے لوگ اپنے گھروں میں تصویریں اور مجسمے رکھتے تھے ... اور ایک گروہ درزیوں اور بافندوں کا تھا جو پردوں اور ملبوسات کو منقش کرنے کے لیے ان پر انسانوں اور جانوروں کی تصویریں بنایا کرتا تھا... زمانۂ جاہلیت کے لوگ اپنے گھروں کی آرایش تصویروں سے اور ایسے کپڑوں سے کرتے تھے جن پر تصویریں بنی ہوتی تھیں۔ اسی طرح وہ تصویروں والے پردے استعمال کرتے تھے۔''

اس تناظر میں یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ ''اس پردے کو دیکھنے سے مجھے دنیا یاد آ جاتی ہے''، تصویر سے نہیں، بلکہ زیب و زینت اور تزئین و آرایش سے متعلق ہے۔

---

۵ دین کے نصوص سے واضح ہے کہ مرغوبات دنیا فی الاصل مباح ہیں۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سرتاسر من جملۂ مباحات ہیں اور الہامی شریعتوں نے انھیں کبھی ممنوع قرار نہیں دیا، مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے اسالیب جب حد اعتدال سے متجاوز ہو جائیں تو یہی مباحات نمود و نمایش اور فخر و استکبار کا مظہر بن جاتے اور انسان کو آخرت سے غافل کر کے دنیا پرستی کی طرف راغب کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے نبی ان میں مستغرق ہونے اور انھیں اوڑھنا بچھونا بنا لینے کو ناپسند کرتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے رغبات دنیا کو اصلاً جائز قرار دیا، انھیں اوڑھنا بچھونا بنا لینے کو ناپسند کیا اور اپنے طبعی میلان اور منصبی ذمہ داریوں کی وجہ سے اپنی ذات کی حد تک ان سے بالعموم گریز ہی کا رویہ اختیار کیا۔ اپنے اہل خانہ کو بھی آپ نے اسی رویے کی تلقین کی۔ چنانچہ اسی طرح کے ایک منقش پردے کو جب آپ نے اپنی صاحب زادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنھا کے دروازے پر لٹکے ہوئے دیکھا تو اسے ناپسند فرمایا اور کسی ضرورت مند کو دے دینے کا حکم دیا:

عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنھما قال اتی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم بیت فاطمة فلم یدخل علیھا وجاء علی فذکرت لہ ذلك فذکرہ للنبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال انی رایت علی بابھا سترا موشیاً فقال ما لی وللدنیا فاتاھا علی فذکر ذلك لھا فقالت لیامرنی فیه بما شاء قال ترسل به الی فلان اھل بیت بھم حاجة.
(بخاری، رقم ۲۶۱۳)

''ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (ایک روز) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تک آئے، مگر گھر میں داخل نہیں ہوئے (اور واپس تشریف لے گئے۔ سیدہ کو یہ معلوم ہوا) تو جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ آئے تو انھوں نے ان سے اس کا ذکر کیا۔ سیدنا علی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (اس کا سبب) معلوم کیا۔ آپ نے فرمایا: میں نے اس کے دروازے پر منقش پردہ دیکھا تھا۔ پھر فرمایا: میرا دنیا سے کیا تعلق۔ پھر سیدنا علی فاطمہ رضی اللہ عنھا کے پاس آئے اور انھیں یہ بات بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں جو چاہتے ہیں، مجھے حکم دیں۔ (سیدہ کی یہ گزارش جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو) آپ نے فرمایا: اسے فلاں گھر والوں کے پاس

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بھجوادو، وہ ضرورت مند ہیں۔''

مسلم کی مذکورہ روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزعمل کا سبب اگر طبعی میلان اور منصبی ذمہ داریوں کو متصور نہ کیا جائے تو آرایش وزیبایش سے آپ کا ابا کرنا دینی عمل قرار پاتا اور اس اعتبار سے لائق اتباع اسوۂ حسنہ کے زمرے میں شامل ہوتا ہے۔ زیب و زینت سے گریز کو دینی عمل تصور کرنا چونکہ قرآنی نصوص، بعض دیگر انبیا کے طرزعمل اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض دوسرے اعمال سے متعارض ہے، اس وجہ سے قرین قیاس یہی ہے کہ منقش پردے کو اتار دینے کا حکم ایک اعتبار سے آپ کی ذاتی پسند و ناپسند کا مظہر اور ایک پہلو سے آپ کی منصبی ذمہ داریوں میں یکسوئی کا آئینہ دار ہے۔

اس تنقیح سے ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ گریز آپ کے طبعی میلان اور منصبی ذمہ داریوں کے تناظر میں ہے تو پھر سیدنا مسیح اور سیدنا یحییٰ علیہما السلام کے دنیا کی لذتوں سے اس کنارہ کشی کے کیا معنی ہیں جس کا حوالہ خود قرآن مجید نے دیا ہے؟

ہمارے نزدیک اس کا سبب بھی ان انبیا کی منصبی ذمہ داریاں ہی ہیں۔ استاذ گرامی جناب جاوید احمد صاحب غامدی سورۂ آل عمران کی تفسیر میں اسی پہلو کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''اس کنارہ کشی کی وجہ یہ تھی کہ یحییٰ و مسیح، دونوں بنی اسرائیل پر عذاب سے پہلے آخری اتمام حجت کے لیے آئے تھے۔ وہ اس بستی میں گھر کیا بناتے جو سیلاب کی زد میں تھی اور اس درخت کی بہار کیا دیکھتے جس کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا تھا۔ ایک ایک دروازے پر دستک دے کر لوگوں کو آنے والے طوفان سے خبردار کرنے والے اپنا گھر بسانے اور اپنا کھیت اگانے میں لگ جاتے تو اپنے فرض سے کوتاہی کے مرتکب قرار پاتے۔ چنانچہ دونوں نے تجرد و انقطاع کا طریقہ اختیار کیا، قوت لایموت پر اکتفا کی، درویشوں کا لباس پہنا اور زمین و آسمان ہی کو چھت اور بچھونا بنا کر زندگی بسر کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ نصاریٰ کی بدقسمتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان جلیل القدر پیغمبروں کی اس منصبی ذمہ داری کو سمجھنے کے بجائے انھوں نے اسے رہبانیت کا رنگ دیا اور پھر اسی کو دین کا اصلی مطالبہ قرار دے کر رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ ہمارے ہاں بھی صوفیوں نے پیغمبروں کی زندگی میں اسی طرح کی بعض چیزوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سے اجنبی تصورات دین میں داخل کر دیے ہیں اور اب گزشتہ کئی صدیوں سے علما کو بھی ان سے متاثر کر لینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔'' (اشراق، اکتوبر ۲۰۰۴)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سیدہ عائشہ کی گڑیاں

۱۔قالت كنت ألعب بالبنات فربما دخل عليّ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وعندى الجوارى فاذا دخل خرجن واذا خرج دخلن.

(ابوداؤد، رقم ۴۹۳۹)

۲۔قالت قدم رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم من غزوة تبوك أو خيبر وفى سهوتها ستر فهبت الريح فكشفت ناحية الستر عن بنات لعائشة لعب فقال ما هذا يا عائشة قالت بناتى ورأى بينهن فرسا له جناحان من رقاع فقال ما هذا الذى أرى فى وسطهن قالت فرس قال وما هذا الذى عليه قلت جناحان قال فرس له جناحان قالت أما سمعت ان لسليمان خيلا لها أجنحة قالت فضحك رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم حتى رأيت نواجذه. (ابوداؤد، رقم ۴۹۳۲)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۱۔''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنھا بیان کرتی ہیں کہ میں گڑیوں سے کھیلتی تھی اور (اس دوران میں) بعض اوقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لے آتے تھے، جبکہ میری سہیلیاں میرے ساتھ ہوتی تھیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے تو وہ چلی جاتیں اور جب آپ تشریف لے جاتے تو وہ آجاتیں۔''

۲۔''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنھا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک یا غزوۂ خیبر سے واپس تشریف لائے۔ گھر کے طاق (میں گڑیاں پڑی تھیں اور اس) پر پردہ لٹکا ہوا تھا۔ پھر ہوا چلی تو سیدہ کی کھیلنے کی گڑیوں پر سے پردہ سرک گیا۔ آپ نے پوچھا: عائشہ، یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا: یہ میری گڑیاں ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ ان کھلونوں میں ایک گھوڑا تھا جس پر کاغذ کے دو پر لگے ہوئے تھے۔ آپ نے (اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) فرمایا: میں ان کے درمیان میں یہ کیا چیز دیکھ رہا ہوں؟ انھوں نے عرض کیا: یہ گھوڑا ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ اس کے اوپر کیا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ پر ہیں۔ آپ نے (ازراہ تفنن) پوچھا: کیا گھوڑے کے پر بھی ہوتے ہیں؟ انھوں نے کہا: کیا آپ نے یہ بات نہیں سنی ہے کہ حضرت سلیمان کے پاس پروں والے گھوڑے تھے؟ سیدہ بیان کرتی ہیں کہ (یہ بات سن کر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے (اور اس قدر ہنسے) یہاں تک کہ میں نے آپ کی ڈاڑھیں دیکھ لیں۔''

ان روایتوں سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

- سیدہ عائشہ کے پاس گڑیاں اور دوسرے کھلونے تھے اور وہ اپنی ہم جولیوں کے ساتھ ان سے کھیلا کرتی تھیں۔
- انھی میں ایک کاغذ سے بنا ہوا پروں والا گھوڑا بھی تھا۔
- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ کو انھیں اپنے پاس رکھنے اور ان کے ساتھ کھیلنے سے منع نہیں فرمایا، بلکہ ایک موقع پر سیدہ سے ان کے بارے میں نہایت دل چسپی کے ساتھ مکالمہ کیا۔

یہ روایتیں مصوری کی اباحت کو نہایت صراحت سے بیان کر رہی ہے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ نے جو گڑیاں استعمال کیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جن پر کوئی نکیر نہیں فرمائی، وہ درحقیقت فن مصوری ہی کا مظہر تھیں۔ اپنی اصل کے لحاظ سے یہ تماثیل ہی تھیں جو مٹی، پتھر، دھات، کاغذ یا کپڑے وغیرہ سے انسانوں، جانوروں اور دیگر مخلوقات کی شبیہوں پر بنائی جاتی اور کھلونوں کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ یہاں ان کے لیے 'بنات' کا لفظ استعمال ہوا ہے، 'لعبة' کا لفظ بھی انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جواد علی نے انھیں چھوٹی تماثیل کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے جو اصلاً بچوں کے کھیلنے کے لیے بنائی جاتی تھیں:

وامـا البـنـات فـالتـماثيل الصغار التـي يلعب بها ...واللعبة التمثال يلعب به الصبيان.

''بنات' چھوٹی تماثیل تھیں جن سے کھیلا جاتا تھا... 'لعبہ' وہ تمثال تھی جس سے بچے کھیلتے تھے۔''

(المفصل فی تاریخ العرب ۵/۱۲۵)

یہ گڑیاں اور کھلونے عام تھے اور گھریلو خواتین بھی اپنے بچوں کا دل لبھانے کے لیے انھیں بنا لیتی تھیں۔ بخاری کی ایک روایت میں نقل ہوا ہے کہ مسلمان خواتین بچوں کو روزہ رکھوانے کے بعد اون کے کھلونے بنا کر ان کا دل بہلاتی تھیں:

عـن الـربيـع بنت معوذ... قـالـت فكنا نصومه بعد و نصوم صبياننا و نـجعل لهم اللعبة من العهن فاذا بكى احدهم على الطعام اعطيناه ذاك حتى يكون عند الافطار.

''ربیع بنت معوذ بیان کرتی ہیں ... (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے) اس حکم کے بعد ہم عاشورہ کے دن روزہ رکھتے، اپنے بچوں کو بھی رکھاتے اور ان کے لیے اون کا ایک کھلونا بنا دیتے۔ جب ان میں کوئی کھانے کے لیے روتا تو ہم اس

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کو یہ کھلونا دے دیتے۔ (وہ بہل جاتا) یہاں تک کہ افطار کا وقت ہو جاتا۔'' (بخاری، رقم ۱۸۵۹)

تکیے پر تصویر

عن عائشة رضی اللّٰه عنها انها کانت اتخذت علی سهوة لها سترا فیه تماثیل فهتکه النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فاتخذت منه نمرقتین فکانتا فی البیت یجلس علیهما. (بخاری، رقم ۲۳۴۷)

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنے گھر کے طاقچے پر ایک ایسا پردہ لٹکایا جس پر تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھینچ کر اتار دیا۔ پھر سیدہ نے اس کے دو تکیے بنا لیے۔ یہ دونوں تکیے گھر میں موجود رہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان پر بیٹھا کرتے تھے۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس روایت سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

- ام المومنین سیدہ عائشہ نے اپنے گھر میں ایسا پردہ لٹکایا جس پر تصویریں بنی ہوئی تھیں۔
- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پردے کو کھینچ کر اتار دیا۔
- سیدہ عائشہ نے اس کپڑے کے دو تکیے بنا لیے۔
- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تکیوں کو ناپسند نہیں فرمایا، بلکہ اپنے استعمال میں لے آئے۔

اس روایت کے آخری جز سے تصویر کی اباحت ہی کی تصدیق ہوتی ہے۔ سیدہ عائشہ کا تصویر والے پردے سے تکیے بنانا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انھیں استعمال میں لانا، اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ یہ روایت مسند احمد میں بھی نقل ہوئی ہے اور اس میں بیان ہوا ہے کہ جس تکیے پر آپ تشریف فرما ہوتے تھے، اس پر تصویر بنی ہوئی تھی:

عن عائشة قالت قدم رسول اللّٰه من سفر وقد اشتریت نمطا فیه صورة فسترته علی سهوة بیتی فلما دخل کره ما صنعت وقال اتسترین الجدر یا عائشة

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لائے۔ میں نے ایک کپڑا خرید کر جس پر تصویر تھی اسے پردے کے طور پر اپنے گھر کے طاقچے پر لٹکا رکھا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (گھر میں) داخل

فطرحته فقطعته مرفقتين فقد رايته متكئا على احداهما وفيها صورة. (مسند احمد، رقم ۲۶۱۴۶)

ہوئے تو آپ نے میرے اس عمل کو ناپسند کیا اور فرمایا: عائشہ، کیا تم دیوار پر بھی پردہ لٹکاتی ہو؟ (سیدہ کہتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کو محسوس کرتے ہوئے) میں نے اسے اتار دیا اور چاک کر کے دو تکیے بنا لیے۔ پھر (ایک موقع پر) میں نے آپ کو ان میں سے ایک کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے دیکھا، جبکہ اس پر تصویر تھی۔''

جہاں تک بخاری کی مذکورہ روایت کے پہلے جز کا تعلق ہے جس کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویروں والے کپڑے کو کھینچ کر اتار دیا تو اس سے بادی النظر میں تصویر کی شناعت کا مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے، مگر روایت کے صحیح فہم تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ اسے لازماً دوسرے جز کے تقابل میں دیکھا جائے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اسی کپڑے سے بنے ہوئے تکیے کو بیٹھنے کے لیے استعمال کیا۔ اس تقابل سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر والے کپڑے کے استعمال کی ایک صورت کو ناپسند کیا اور دوسری کو ناپسند نہیں کیا۔ طرز عمل کے اس اختلاف کا سبب اسی روایت کے ایک دوسرے طریق میں نہایت صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ مسلم کی روایت ہے:

قالت عائشة خرج (رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم) فى غزاته فاخذت غطا فسترته على الباب فلما قدم فرأى النمط عرفت الكراهية فى وجهه فجذبه حتى هتكه أو قطعه وقال إن اللّٰه لم يأمرنا أن نكسو الحجارة والطين. قالت فقطعنا منه وسادتين وحشوتهما ليفا فلم يعب ذلك علی. (مسلم، رقم ۲۱۰۷)

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کے لیے تشریف لے گئے۔ میں نے ایک پردہ لیا اور اسے دروازے پر لٹکا دیا۔ جب آپ واپس تشریف لائے اور پردہ دیکھا تو آپ نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ پھر آپ نے اس کو کھینچا یہاں تک کہ پھاڑ ڈالا یا کاٹ ڈالا۔ پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہم کو پتھر اور مٹی کو کپڑا پہنانے کا حکم نہیں دیا۔ سیدہ بیان کرتی ہیں کہ پھر ہم نے اس کو کاٹ کر دو تکیے بنا لیے اور ان میں کھجور کی چھال بھر دی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

آپ نے اس کو ناپسند نہیں فرمایا۔''

اس روایت سے واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پردے کو اس وجہ سے اتارا کہ وہ دیوار پر لٹکا ہوا تھا اور اس کی علت یہ بیان فرمائی کہ اللہ نے مٹی اور پتھر کو کپڑا پہنانے کا حکم نہیں دیا۔ اس بنا پر یہ بات ہر لحاظ سے متعین ہوگئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پردے کو اتارنے اور قطع کر دینے کا سبب نمود و نمایش یا اسراف تو ہوسکتا ہے، تصاویر ہرگز نہیں ہوسکتیں۔ چنانچہ مذکورہ روایت سے تصویر کی شناعت کا مفہوم ہرگز اخذ نہیں کیا جاسکتا۔

تصاویر اور نماز

عن انس قال کان قرام لعائشة سترت به جانب بیتها . فقال لها النبی صلی اللّٰه علیه و سلم امیطی عنی فانه لاتزال تصاویره تعرض لی فی صلوٰتی. (بخاری، رقم ۵۹۵۹)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک پردہ تھا۔ انھوں نے اس سے گھر کے ایک کونے کو ڈھانپا ہوا تھا۔ (اس پر تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ ایک موقع پر) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (سیدہ سے) فرمایا: اسے میرے سامنے سے ہٹا دو، کیونکہ اس کی تصاویر میری نماز میں مخل ہوتی رہتی ہیں۔''

اس روایت سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آپ کی اہلیہ سیدہ عائشہ نے ایک پردہ لٹکایا ہوا تھا۔
- اس پردے پر تصویریں نقش تھیں۔
- یہ ایسے رخ پر تھا کہ جب آپ گھر میں نماز پڑھتے تو اس کی تصویریں آپ کے سامنے آجاتیں۔
- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ کو اسے ہٹانے کا حکم دیا۔
- اس کا سبب بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ یہ تصویریں میری نماز میں خلل انداز ہوتی رہتی ہیں۔
- 'لاتزال تصاویره تعرض لی فی صلوٰتی' یعنی ''اس کی تصاویر میری نماز میں مخل ہوتی رہتی ہیں'' کے الفاظ سے واضح ہے کہ یہ پردہ کچھ روز تک لٹکا رہا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ روایت نہایت وضاحت کے ساتھ تصویروں کے جواز کو بیان کر رہی ہے۔ سیدہ عائشہ کا پیغمبر کے گھر میں تصویروں والا پردہ لٹکانا بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ تصویریں اپنی اصل کے لحاظ سے کسی طرح بھی دائرۂ شناعت میں نہیں آتیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھتے ہی ہٹانے کا حکم نہیں دیا۔ تصویر اگر حرام ہوتی تو آپ اسے دیکھتے ہی پردے کو اتارنے کا حکم ارشاد فرماتے۔ مزید براں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پردے کو ہٹانے کی جو وجہ بیان فرمائی ہے، اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے تصاویر کو ان کے شنیع ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ نماز میں ان کی طرف توجہ مبذول ہو جانے کی وجہ سے ہٹانے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس حکم کا تعلق اصلاً تصاویر سے نہیں، بلکہ ہر اس چیز سے ہے جو کسی موقع پر سماعت و بصارت کے ذریعے سے اللہ کی حضوری میں اختلال کا باعث بن جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ اس معاملے میں نہایت محتاط تھا۔ ایک موقع پر جب نماز کے دوران میں آپ کی توجہ اپنی اوڑھی ہوئی چادر کے حاشیے کی طرف مبذول ہوئی تو آپ نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد اسے ایک صحابی کو بھجوا دیا اور اس کے بدلے میں ان سے سادہ چادر منگوالی:

عن عائشة ان النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم صلی فی خمیصة لها اعلام فنظر الی اعلامها نظرة فلما انصرف قال: اذهبوا بخمیصتی هذه الی ابی جهم واتونی بانبجانیة ابی جهم فانها الهتنی انفا عن صلاتی ... کنت انظر الی علمها وانا فی الصلاة فاخاف ان تفتننی. (بخاری، رقم ۳۶۶)

''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنھا بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حاشیہ دار چادر میں نماز پڑھی جس پر (بیل بوٹوں وغیرہ کے) نقوش تھے۔ آپ نے ان پر ایک نظر ڈالی۔ پھر جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: یہ چادر ابوجہم کو دے آؤ اور (اس کے بدلے میں) ان سے (نقوش کے بغیر) سادہ چادر لے آؤ۔ اس چادر نے ابھی مجھے نماز سے غافل کر دیا تھا ... (دراصل) میں نماز میں اس کے نقش کو دیکھ رہا تھا، مجھے ڈر ہے کہیں وہ میری نماز میں خلل نہ ڈال دے۔''

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ساجد حمید

صبر کیا ہے، اسے کیسے حاصل کریں؟

(۳)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

صبر کی اہمیت قرآن مجید میں

حق کی بقا کا انحصار صبر پر

اللہ تعالیٰ نے صبر کا مطالبہ اس لیے کیا ہے کہ حق اس دنیا میں موجود رہے اگر حق پر رہنے والے لوگ معدوم ہو جائیں تو پھر حق کہاں سے ملے گا۔ اس طرح ایک فرد کی زندگی میں بھی حق کی بقا اسی میں ہے کہ وہ حق پر قائم رہنے کے لیے ثابت قدمی دکھائے۔ آثار صحابہ میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ 'لا ایمان له لمن لا صبر له'، اس کا ایمان ہی نہیں جس کے پاس صبر نہیں۔ یعنی جو آدمی صبر نہیں کر سکتا اس کا ایمان جاتا رہے گا۔ وہ صبر کی صفت نہ ہونے کے سبب سے اس بات سے محروم ہوتا ہے کہ وہ مشکل گھڑی میں ایمان کو قائم رکھ سکے، وہ تھڑدلوں کی طرح پل میں تولہ اور پل میں ماشہ ہوتا رہتا ہے۔ ایسے آدمی کی تصویر قرآن نے یوں کھینچی ہے:

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ، فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ، فَيَقُوْلُ: رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ: رَبِّيْٓ اَهَانَنِ. (۸۹: ۱۵۔۱۶)

''پر اس انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا خدا امتحان کرتا پھر اسے عزت و نعمت بخشتا ہے تو وہ خیال کرتا ہے میرے رب نے میری شان بڑھائی۔ اور جب وہ اسے جانچتا پھر (اس غرض سے) رزق میں تنگی کرتا ہے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر ڈالا۔''

ایک اسی تصویر کا پہلو یہ بھی ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا، اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا، وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا. (۷۰:۱۹-۲۱)

''انسان کی گھٹی میں بے صبری پڑی ہے، جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ گھبرانے لگ جاتا ہے اور جب فراخی حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے۔''

بے صبری انسان کے اندر سے عزم و حوصلہ اور کشادگی اور اعلیٰ ظرفی کی نوعیت کی چیزوں کو کم کر دیتی ہے۔ اور وہ تھڑ دلی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس کے بعد حق پر اس کا قائم رہنا ممکن نہیں رہتا۔

امت اسلامیہ اس وقت اسی بے صبری کا شکار ہے۔ اس لیے کہ اس کے ہاں ''دشمن'' کے منفی اقدامات کا جواب دینے میں یہی رنگ پایا جاتا ہے کہ وہ مثبت اقدامات کے بجائے منفی اقدامات کرتی ہے۔ حق پر استقامت کے بجائے غلط طریقوں سے انتقام لیتی ہے۔ عدل و انصاف کے بجائے ردعمل میں آ کر ناانصافی کرتی ہے وغیرہ۔ اپنے انھی جذبات کی بنا پر امت اس وقت اس حق پر قائم نہیں رہ پاتی ہے، جس کا نقیب اور امین اللہ نے اسے بنایا تھا۔

مثلاً اس کے پاس ایک بنیادی نیکی جسے عدل کہا جاتا ہے وہی موجود نہیں ہے، تو باقی نیکیاں چہ معنی دارد۔ اس لیے کہ عدل ہی وہ نیکی ہے جو ساری نیکیوں کو وجود بخشتی ہے۔ ہمیں قیام بالقسط کا حکم دیا گیا ہے مگر ہماری اکثریت اس پر قائم نہیں ہے۔ البتہ ایک اقلیت اس پر قائم ہے اور یہ اقلیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ چنانچہ اسلام جو سراپا حق ہے اس وقت اس کے علم بردار ناحق پر سمجھے جاتے، اور ان کی رسوائی اسلام کے حصے میں بھی آ رہی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حق کو اپنے ماننے والوں کا سہارا ہی حاصل نہیں ہے، تو دنیا میں قائم کیسے رہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نصرت الٰہی کا نزول اور صبر

قرآن مجید میں 'ان اللّٰه مع الصابرین' (اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) کی نوید محض ثابت قدموں ہی کے لیے ہے۔ قوم اور فرد سب کے لیے یہ ایک ہی اصول ہے۔ محض اتنا فرق ہے کہ افراد کے لیے اس صبر کا ہر نیکی کی طرح نتیجہ اصلاً قیامت کے دن نکلنا ہے اور اقوام کی ثابت قدمی کا نتیجہ اسی دنیا میں، عروج و رفاہیت کی صورت میں نکلتا ہے۔ یعنی اجتماعی معاملات میں خدا کا یہ ساتھ دنیا ہی میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ ایک اجتماعیت جیسے ہی حق پر قائم رہنے کی جدوجہد کرنے لگتی ہے، تو اللہ تعالیٰ کا ساتھ ظاہر ہونے لگ جاتا ہے۔

ملت اسلامیہ کے ساتھ یہ نصرت بھی اسی صورت میں آئے گی جب ہم اپنا عمل پورا کر دیں گے۔ ہمارا عمل یہ ہے کہ شہداے ملت حق پر بہرصورت قائم رہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے معاملات کرتے ہوئے اس کے احکام پر عمل پیرا ہوں۔ اور عمل پیرا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ان کو صحیح معنی میں سمجھنے کی کوشش کریں اور جو معنی دیانت داری سے سمجھ آ جائیں ان پر

اسی دیانت سے عمل کریں تو اللہ کی مدد ضرور شامل حال ہوگی۔ ہماری مراد یہ ہے کہ یہ نصرت صبر کے ساتھ مشروط ہے ہمارے محض برائے نام مسلمان ہونے سے یہ چیز ہمیں حاصل ہونے کی نہیں ہے۔

دنیوی کاموں میں تجربہ گواہ ہے کہ خدا کی مدد محنت کے ساتھ مشروط ہے۔ خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، محنت کرنے والے خدا کی مدد و نصرت پاتے ہیں۔ اس میدان میں پوری استقامت اور تسلسل کے ساتھ محنت کرنا صبر ہے۔ ایسی محنت ہی ثمر بار ہوتی اور نتائج لاتی ہے۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ 'ان اللّٰہ مع الصابرین' کی اس نوید کا ایک رخ ذریت ابراہیم کے ساتھ خاص ہے۔ یعنی ذریت ابراہیم اگر دین میں ثابت قدمی دکھاتی ہے تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو اصول دیا ہے وہ یہ ہے کہ 'اذکرونی اذکرکم' (البقرہ) مجھے یاد رکھو گے تو میں تمھیں یاد رکھوں گا۔ اس یاد رکھنے سے مراد یہی مدد و نصرت ہے، جو انھیں حاصل ہوتی رہے گی۔ اور ذریت ابراہیم کے یاد رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین پر ثابت قدم رہے۔

اللہ کا سہارا

صبر اس اعتبار سے بھی ایک اہم وصف ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لیے سہارے کا سبب ہے۔ ہم یہ بات جان چکے ہیں 'ان اللّٰہ مع الصابرین'، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ آپ کو اللہ کا سہارا صبر کرنے کی صورت میں ملے گا۔ اس دنیا میں بے شمار مواقع ہیں، جن میں ہمیں خدا کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس میں ایک عجیب نفسیاتی پہلو بھی موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ صابر آدمی کو پہلے ہی مرحلے پر ایک نفسیاتی تفوق حاصل ہوتا ہے۔ وہ مصائب پر چیخنے چلانے کے بجائے، سب سے الگ طریقے پر حوصلہ اور عزم سے کھڑا ہوتا ہے۔ یہ چیز ان کے لیے صدمہ کے آغاز ہی میں سہارا بن کر ظاہر ہو جاتی ہے اور اگر مصیبت اور صدمہ سنگین ہوتا چلا جائے تو پھر اس سے نکلنے کی راہ یا سہنے کی طاقت ملتی چلی جاتی ہے۔ سیدنا یوسف کو جب زلیخا نے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کی، تو سیدنا یوسف پورے عزم و حوصلے سے ڈٹے رہے۔ قرآن کے مطابق ان کے عزم کی گرفت ڈھیلی پڑ سکتی تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں بچا لیا۔ سورۂ یوسف میں اس کی تفصیل یوں کی گئی ہے:

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ، وَ غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ، وَ قَالَتْ هَیْتَ لَكَ. قَالَ: مَعَاذَ اللّٰهِ، اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ، اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ. وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ، وَ هَمَّ بِهَا، لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ	''اور جس عورت کے گھر میں وہ تھا، وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگی، اور اس نے دروازے بند کر لیے اور بولی کہ بس آ جاؤ۔ اس نے کہا اللہ کی پناہ، وہ (تیرا شوہر) میرا آقا ہے اس نے مجھے خاطر مدارت سے رکھا ہے۔ حق تلفی کرنے والے کبھی فلاح نہیں پاتے۔ اور عورت نے تو اس

رَبِّہٖ کَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ. (۱۲:۲۳۔۲۴)

کا قصد کر ہی لیا تھا، اور وہ بھی اس کا قصد کر ہی لیتا اگر اس نے اپنے رب کی واضح نشانی نہ دیکھ لی ہوتی۔ ہم نے ایسا کیا تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور رکھیں۔ اس لیے کہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔''

سیدنا یوسف کی ثابت قدمی درج ذیل الفاظ میں واضح ہے: ایک اس جملے سے کہ ''وہ (تیرا شوہر) میرا آقا ہے اس نے مجھے خاطر مدارت سے رکھا ہے۔ حق تلفی کرنے والے کبھی فلاح نہیں پاتے''۔ اور دوسرے ان الفاظ سے کہ ''اور وہ بھی اس کا قصد کر ہی لیتا اگر اس نے اپنے رب کی واضح نشانی نہ دیکھ لی ہوتی۔'' آیات کا اختتام جن الفاظ پر ہوا ہے وہ یہ ہیں کہ ''ہم نے ایسا کیا تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو دور رکھیں۔ اس لیے کہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔''

یہ آخری بات یہ بتا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی برائی سے بچنے میں مدد کرتے ہیں، اگر وہ اپنے صبر و استقامت سے یہ ثابت کر دیں کہ وہ اللہ کے مخلص بندے ہیں۔ جن لوگوں کو اپنی خامیوں پر قابو پانے میں مشکل پیش آتی ہے۔ ان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ پورے اخلاص کے ساتھ کوشاں نہیں ہوتے۔ وگرنہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آدمی اخلاص کے ساتھ برائی دور کرنا چاہے اور اللہ اسے دور نہ کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر بندہ میرے راستے میں جدوجہد کرے گا تو میں اس کے لیے اپنی ہدایت کے راستے کھولوں گا۔ (العنکبوت ۲۹:۶۹)

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت کی زندگی کی مشکلات میں، اللہ کی مدد کا جو وعدہ تھا، اس کی حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ آپ کے صبر اور محسن ہونے کے ساتھ مشروط تھا۔ فرمایا گیا کہ

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ. اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ. (۱۶:۱۲۷۔۱۲۸)

''اور صبر کرو، اور تمھیں اللہ کے بغیر صبر حاصل نہیں ہو سکتا۔ تم نہ ان پر غم کرو، اور نہ جو یہ چالیں چلتے ہیں ان سے پریشانی میں مبتلا ہو۔ اس لیے کہ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا اور وہ محسن بھی ہیں۔''

یہاں دیکھیے، جس سہارے کا ذکر کیا گیا ہے، وہ درحقیقت تقویٰ اور احسان کے ساتھ مشروط ہے۔ یعنی یہ (ساتھ دینے یا سہارا بننے) کا جو ذکر صبر کے حکم کے ساتھ شروع ہوا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ صبر اگر نہ ہو تو یہ سب کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ نہ تقویٰ باقی رہے گا، اور نہ احسان۔ اور نہ ان دونوں سے محرومی کے بعد اللہ تعالیٰ کا یہ سہارا حاصل ہوگا جس کی بنا پر آدمی غم نہیں کھاتا اور دوسروں کی ریشہ دوانیوں سے نہیں گھبراتا۔ امت اسلامیہ کے افراد اور اجتماعی دھڑے اس فریب کا شکار ہیں کہ انھیں خدا کا یہ سہارا، بس مسلمان ہونے کی وجہ سے مل جائے گا۔ اس آیت سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا علیہم السلام اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ وعدۂ نصرت بھی چند شرائط کے ساتھ ہی کیا تھا۔ اگر وہ شرائط پوری نہ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہوتیں، تو سیدنا یونس کی داستان ہمارے سامنے ہی ہے۔

صبر احسان ہے

صبر کی اہمیت میں یہ بات بھی ہمارے سامنے رہنی چاہیے کہ صبر ان چیزوں میں سے ہے، جنھیں قرآن مجید احسان قرار دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ صبر محسنین کا وصف ہے قرآن مجید کا بیان ہے:

وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ. ''اور ثابت قدم رہو، اللہ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

(۱۱:۱۱۵)

وہ لوگ جو آخرت کے لحاظ سے کامیابی پانے کے لیے نیکی کرتے ہیں، ان کو قرآن مجید نے محسن قرار دیا ہے اور جو لوگ اسی دنیا کو اصل سمجھ کر اسے کمانے کی دوڑ میں لگے رہتے ہیں، انھیں قرآن مجید نے 'ظالمی انفسھم' (اپنے اوپر ظلم کرنے والے) قرار دیا ہے۔ (الصافات ۳۷:۱۱۳) جو لوگ راہ حق میں صبر اور ثابت قدمی دکھاتے ہیں وہ دراصل اپنے محسن آپ ہیں۔ دنیا میں انھیں صبر کی بنا پر جو عزت ملے گی سو ملے گی آخرت میں بھی انھیں اس احسان کا بدلہ ضرور ملے گا۔ احسان کے معنی حسن سلوک کے ہیں، اور وہ انسان اپنا محسن ہے جو اپنے ساتھ حسن سلوک کرے اور وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو آخرت کی تیاری میں لگا دے۔ اگر وہ وہاں کامیاب ہو گیا تو اس سے بڑا محسن کون ہو گا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قرآن مجید نے مندرجہ بالا آیت میں ایک اشارہ اس بات کی طرف کیا ہے کہ صبر محسن آدمی کے لیے ضروری ہے۔ صبر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ نے یہ نوید دی ہے کہ جو آدمی صبر کرے گا تو ایسے محسن کا میں اجر ضائع نہیں کروں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ محسن بننے والے کے لیے صبر ایک اہمیت رکھتا ہے۔ نیکیوں پر ثابت قدم رہنے والا (صبر کرنے والا) محسن ہے۔ (یوسف ۱۲:۹۰)

محسن آدمی چونکہ صابر بھی ہوتا ہے اس لیے جو بات قرآن مجید نے 'ان اللّٰہ مع الصابرین' کے الفاظ میں صابروں کے لیے کہی ہے وہی بات 'ان اللّٰہ لمع المحسنین' کے پیرائے میں محسنین کے لیے کہی ہے۔ (العنکبوت ۲۹:۶۹)

صبر کا صلہ

قرآن مجید کے مطابق سب سے بڑا صلہ جس چیز کو ملنا ہے، وہ صبر ہے۔ اسی طرح قوموں کی زندگی میں عروج پانے اور دوسری اقوام کے مقابلے میں غلبہ حاصل کرنے کے لیے بھی صبر ہی اسلحہ و جہاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی انفرادی زندگی میں فرد اگر حق پر قائم رہے گا تو اللہ اسے جنت میں اعلیٰ مقامات عطا فرمائے گا۔ اور اگر کوئی قوم اپنے اجتماعی وجود میں حق پر قائم رہتی ہے تو وہ دنیا میں فائز المرامی پائے گی۔ قرآن مجید نے فرمایا ہے:

اِنِّیْ جَزَیْتُھُمُ الْیَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا اَنَّھُمْ ھُمُ ''آج میں نے ان کو ان کے صبر کا بدلہ دیا ہے۔ اور آج یہ

الْفَآئِزُوْنَ. (المومنون۲۳:۱۱۱) — فائزالمرام (کامیاب وکامران) ہیں۔''

اسی طرح یہ دیکھیے:

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا. (الفرقان۲۵:۷۵) — ''یہی لوگ ہیں جنھیں بالا خانے ملے ہیں اس بنا پر کہ انھوں نے صبر کیا، اور (اسی صبر کی بنا پر) وہاں ان کا خیر مقدم تحیت وسلام سے ہوگا۔''

یہاں یہ بات محض یاددہانی کے لیے سمجھ لیجیے کہ صبر پر جنت اس بات کا صلہ ہے کہ آدمی نے ساری زندگی اس طرح گزاری ہے کہ وہ ہر حالت میں اپنے رب پر راضی رہا ہے۔ اور کسی موقع پر بھی اس نے خدا سے مایوس ہو کر کوئی اور در نہیں کھٹکھٹایا۔ وہ کسی موقع پر اخلاق سے عاری نہیں ہوا، وغیرہ۔

صبر کا دہرا صلہ

صبر ایک ایسا عمل ہے کہ جس میں انسان ایک موقع پر دو عمل کر رہا ہوتا ہے۔ ایک مصیبت کو برداشت کرنا اور دوسرے برے عمل واقدام سے رکے رہنا۔ یہ چیز انسان کو اس بات کا مستحق بناتی ہے کہ وہ دوہرا اجر پائے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے یہ بتایا ہے کہ اس صبر کا اجر دہرا ہے، جس کے ساتھ برائی کے بدلے میں نیکی کی گئی ہے:

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ. (القصص۲۸:۵۴) — ''یہ لوگ ہیں کہ جنھیں دہرا اجر ملے گا، بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے، اور وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے، اور ہمارے دیے ہوئے رزق سے خرچ کرتے ہیں۔''

مراد یہ ہے کہ ہم اگر راہ حق میں آنے والے مصائب، لوگوں کی طعن وتشنیع کو ایک صابر آدمی کی طرح لیں یعنی ان کی برائی پر آپے سے باہر نہ ہوں، اور بد اخلاقی پر نہ اتریں، بلکہ ان کی برائی کے بدلے میں بھی نیکی کریں تو اس طرح کے صبر کے بعد ہمیں دوہرا صلہ ملے گا۔ ایک ان کی برائی پر صبر اور دوسرے اس کے جواب میں نیکی کرنے پر۔

اس کو ہم مثالوں سے سمجھتے ہیں۔ مثلاً جب ہم ابتلا میں ہوں، اور اس ابتلا میں خدا کی یاد سے غافل نہ ہوں اور جیسے ہی نماز کا وقت آئے تو ہم خدا کے حضور کھڑے ہو جائیں تو یہ نماز دوہرے اجر کی مستحق ہے۔ اور اسی طرح اگر ہمارے ساتھ کوئی برائی کرے، اور ہم اس کی برائی کو برداشت بھی کریں اور اس کے ساتھ نیکی بھی کریں تو یہ نیکی دوہرے اجر کی حق دار ہوگی۔

ذریعۂ استعانت

صبر کی اہمیت اس پہلو سے بھی قرآن کی روشنی میں ہمارے سامنے آتی ہے کہ صبر ان اوصاف میں سے ہے کہ جو نیکی پر چلنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ صبر اصل میں ہمارے ذہن وقلب کا حصہ بن کر ایک نفسیات کی تخلیق کرتا ہے۔ جو ہمارے لیے مدد ومعاون

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ہوتی ہے۔

یہ نفسیات یہ ہے کہ یہ دنیا آزمایش کے لیے بنی ہے۔ ہمیں اس میں کامیاب ہونا ہے۔ اس دنیا کی ہر مشکل اور ہر آسانی اصل میں میرے امتحان کے لیے آتی ہے۔ میں ہر لمحہ امتحان میں ہوں۔ مجھے کوئی دھکے دے یا گھر سے نکال دے، کوئی گالی دے یا تہمت باندھے، کوئی مذاق اڑائے یا نام بگاڑے، کوئی جسمانی اذیت دے یا ذہنی سب میرے لیے امتحان ہیں۔ میں نے ان میں کامیاب ہونا ہے۔ اس بات پر ہر گھڑی قائم رہنا ہی صبر کی نفسیات ہے۔ چنانچہ اس نفسیات کے حامل کو جب بھی مشکل پیش آئے گی تو وہ درج ذیل دو راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرے گا:

پہلا راستہ: اگر وہ اسی آزمایش کے لحاظ سے سمجھے گا کہ اسے انتقام لینا چاہیے، اور یہی حق کا تقاضا ہے، اور اگر انتقام نہ لیا گیا تو یہ شخص ظلم کرنے کا عادی ہو جائے گا، تو پھر قانون وشریعت کے مطابق انتقام لے گا اور اتنا ہی انتقام لے گا جتنا اس پر ظلم کیا گیا ہے۔

دوسرا راستہ: اگر آزمایش کا تقاضا اسے یہ معلوم ہو رہا ہو کہ اس کو معاف کرنا ہی بہتر ہے، نہ صرف معاف کرنا، بلکہ اس کے ساتھ نیکی کرنا بھی ضروری ہے تو اس صورت میں وہ نیکی بھی کر دے گا۔

یہ نفسیات جس میں آخرت کی کامیابی اصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر استقامت دکھانا ہمیشہ اس بات میں معاون رہے گا کہ آپ کے حوصلوں کو پست نہ ہونے دے اور آپ کو نیکی اور خیر کی طرف لگائے رکھے۔

مزید یہ بات بھی ہے کہ اس نفسیات کے اثرات کے بعد آدمی اگر کسی وقت مشکل میں ڈگمگانے لگے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے شامل حال ہو کر اسے بچا لیتی ہے۔ یعنی اصل میں صبر حق پر قیام کے لیے ہماری دہری مدد کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ ہماری نفسیات اور ہمارے قویٰ اور ذہن کو مضبوط بناتا ہے اور دوسرے یہ کہ اگر ہم کہیں کمزور ہونے لگتے ہیں تو اللہ کی مدد آنے کا باعث بنتا ہے۔ یہ ہم اوپر جان چکے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے پاس کن مشکلات میں اللہ کی برہان نازل ہوئی۔

'نفس مطمئنۃ' کو عام طور سے غلط سمجھا جاتا ہے کہ شاید یہ بھی نفس کی نفس لوامہ کی مانند کوئی قسم ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ دراصل ہر وہ آدمی ہے جو اپنے رب کی نعمتوں پر شکر گزار رہا، بندوں کے حقوق ادا کرتا رہا، تنگی میں صابر و قانع رہا، اور اسی طرح زندگی کے تمام مراحل میں اپنے رب کے ہر فیصلہ پر راضی رہا۔

لا ایمان لمن لا صبر لہ

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے آثار میں یہ بات منقول ہوئی ہے کہ جو صبر نہیں کر سکتا اس کے پاس ایمان نہیں ہے۔ یہ بات صحابہ کی زندگیوں کا نچوڑ ہے۔ انھیں جس طرح کی مشقتیں سہنی پڑیں اور انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ بے صبرے قسم کے لوگ یا تو منافق بن کر رہتے رہے اور یا پھر ارتداد کا شکار ہوئے (مانعین زکوٰۃ وغیرہ)۔ اگر اس زندگی کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جائے کہ اس وقت اصل مسئلہ کیا تھا، تو قرآن کا تجزیہ بھی یہی ہے کہ یہود جو ایمان نہیں لا پا رہے تھے تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ان میں صبر (حق پر قیام کی کوشش) کا وصف نہیں تھا۔ اور یہی چیز صحابہ نے ان ایمان لانے والوں میں دیکھی جو منافقت اختیار کیے ہوئے تھے۔ اس لیے صبر کی اہمیت اس پہلو سے نہایت بڑھ جاتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ نئے سامنے آنے والے حق کو ماننا صبر کے بغیر ممکن نہیں، بلکہ اگر کسی حق کو آدمی مانتا ہے تو اس پر قائم رہنا بھی صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

صبر ایک وسیلۂ ظفر ہے۔ اسی سے ایمان و حق حاصل ہوتا اور اسی سے اس پر قیام ممکن ہوتا اور اسی سے ہم نے اوپر یہ جانا ہے کہ حق پر قائم رہنے کے لیے خدا کی مدد و نصرت ہمیں حاصل ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں آدمی کے پاس نہ ہوں تو ایمان بچانا کیسے ممکن ہے۔ آپ پر لازم ہے کہ آپ اپنے آپ کو حق پر قائم رکھیں۔ یہی صبر ہے۔ اس منزل میں جتنی مشکل آئے گی خدا اس میں سے آپ کے لیے حق پر قائم رہنے کے راستے نکال لے گا۔

خلاصہ

اس باب میں ہم نے یہ جانا کہ حق کی بقا کا انحصار صبر پر ہے۔ یہ دنیا میں بھی اور آدمی کے دل میں بھی حق کے قائم رکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر یہ وصف انسانوں میں باقی نہ رہے تو یہ دنیا حق سے محروم ہو جائے گی۔ اسی طرح یہ بات بھی واضح ہے کہ اگر انسان اپنی زندگی کی آزمایشوں میں بے صبرا ہو تو وہ دونوں امتحانوں (تنگی و آسانی) میں ایک تھڑدلا انسان بن کر نمودار ہوتا ہے۔

اسی طرح صبر کی وجہ سے ہی اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت ہمیں حاصل ہوتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی معیت کی صورت میں ہمارے لیے ایک سہارا بنتی ہے۔ 'ان اللّٰہ مع الصابرین' کا اصول بتاتا ہے کہ اللہ کی مدد محض مسلمان کہلائے جانے والوں کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس بات کے ساتھ مشروط ہے، وہ جس اسلام کے ماننے والے ہیں، اس پر صبر اور ثابت قدمی سے عمل کرنے والے بھی ہوں۔ وہ ہر ہر قدم پر اس پر قائم رہیں۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کی مدد ان کی زندگیوں میں ظاہر ہو گی۔

صبر احسان ہے، یعنی انسان کا اپنے ساتھ بہترین حسن سلوک یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو آخرت کی تیاری میں لگا دے، اور اس کی بہترین صورت صبر کا وصف ہے۔

صبر کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ اس کے بعد جو نیکی بھی ہم کریں گے وہ صبر کی نیکی کے ساتھ مل کر دوہرے اجر کی مستحق ہو جائے گی۔ یعنی جب ہم ابتلا میں ہوں، اور اس ابتلا میں خدا کی یاد سے غافل نہ ہوں اور جیسے ہی نماز کا وقت آئے تو ہم خدا کے حضور کھڑے ہو جائیں تو یہ نماز دوہرے اجر کی مستحق ہے۔ اور اسی طرح اگر ہمارے ساتھ کوئی برائی کرے، اور ہم اس کی برائی کو برداشت بھی کریں اور اس کے ساتھ نیکی بھی کریں تو یہ نیکی دوہرے اجر کی حق دار ہو گی۔

صبر کو قرآن مجید نے نماز کی طرح ذریعۂ استعانت بھی قرار دیا ہے۔ یعنی اس کے ذریعے سے ہم مشکلات میں مدد حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی استعانت کی ایک اہم مثال یہود سے مطالبہ ایمان کے وقت کی ہے ان سے یہ کہا گیا کہ محمد عربی پر ایمان لانا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حق پرستی کا تقاضا ہے اور اس حق پر قائم رہنے کے لیے صبر سے مدد لو یعنی حق پرستی کی روش اختیار کرو۔ اسی چیز کے پیش نظر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کہا کرتے تھے کہ 'لا ایمان له لمن لاصبر له'۔

انسانی سرشت اور صبر

انسانی سرشت میں اللہ تعالیٰ نے تمام اوصاف خواہ وہ بظاہر منفی یا سلبی نظر آتے ہوں، وہ سب دراصل مثبت اور ایجابی ہیں۔ مثلاً قرآن مجید نے بتایا ہے کہ 'کان الانسان عجولا' (انسان اپنی سرشت میں جلد باز ہے)۔ جلد بازی اگرچہ ایک منفی چیز ہے، مگر یہ بنی نوع انسان میں اس لیے رکھی گئی ہے تاکہ وہ ان سب امور کی طرف سبقت کرنے والا بنے، جن کو خیر اور نیکی کہا جاتا ہے۔ مگر چونکہ اسے اس دنیا میں خلافت کی نوعیت کا اقتدار بھی ملا ہے اس لیے وہ اپنے اس اختیار کی بنا پر ان تمام داعیات کو غلط جگہ پر استعمال کر لیتا ہے۔ جس سے خرابی وجود میں آتی ہے۔

حصول خیر میں جلد بازی کا یہ جذبہ اس لیے انسان کو دیا گیا تھا کہ وہ نیکی کی طرف بڑھے اور اس میں سب سے سبقت کرنے کی سعی کرے، مگر اس دنیا میں ہم دنیا کے بھلے کے لیے جلد بازی سے کام لینے لگ جاتے ہیں۔ تو ہماری سرشت عجل حب عاجلہ کی صورت میں ظاہر ہو کر منفی بن جاتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

یعنی قرآن مجید نے جن منفی داعیات کا ذکر کیا ہے۔ وہ دراصل ان مثبت داعیات کے نمائندہ ہیں جن کو حق پرستی ہی کے لیے ہماری سرشت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ ان کا وجود ان کے دوسرے رخ کا پتا دیتا ہے۔ قرآن میں مخاطب کے منفی داعیات کو زیر بحث لا کر گویا ان کا تعارف کرایا گیا ہے کہ یہ چیزیں ان میں جلب خیر کے بجائے جلب شر کا ذریعہ بن رہی ہیں۔ اس لیے ان کو قابو کرنا ضروری ہے۔ اور ان کے قابو کرنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ انھیں صحیح رخ پر ڈال دیا جائے۔

قرآن مجید نے ہماری سرشت میں موجود جن داعیات کا ذکر کیا ہے وہ درج ذیل صفات کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ عجول

۲۔ ظلوم

۳۔ جهول

۴۔ ضعيف

۵۔ قتور

۶۔ ھلوع

اب ہم سرشت انسانی کے ایک ایک پہلو کو سامنے رکھ کر اس بات کا جائزہ لیں گے کہ صبر کا ان سے کیا تعلق ہے۔ اس تعلق کو سمجھنے سے ہمیں یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ ہم صبر کے لحاظ سے کن مشکلات کا شکار ہو سکتے ہیں اور یہ کہ ہماری سرشت کے ان پہلوؤں کا اصل استعمال کیا ہے، جس سے فائدہ اٹھا کر ہم صبر کے حصول کے قریب ہو سکتے ہیں۔

عجول ہونا اور صبر

'عجول' جیسا کہ اس باب کی تمہید میں ہم نے جانا کہ جلد بازی سے تعبیر ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید نے اسے عاجل نہیں کہا۔ اس لیے کہ عاجل میں اگرچہ اسم صفت ہے، مگر دوام کا مفہوم اور مبالغہ کا مفہوم ایسا نہیں ہے جیسا 'عجول' میں ہے۔ قرآن مجید نے یہ صفات انسانی اس اسلوب میں بیان کی ہیں کہ 'خلق من عجل ، خلق الانسان عجول'، یا 'کان الانسان عجولا' وغیرہ۔ اس اسلوب سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہ دراصل انسان کی سرشت بتائی جا رہی ہے۔

عجول کے معنی جیسا ہم نے بتایا کہ عجلت پسندی کے ہیں، یعنی جو دل میں خیال آجائے اس کے لیے تیزی دکھانا۔ یہ وصف درحقیقت حصول منفعت میں تیزی دکھانے کے لیے رکھا گیا تھا تاکہ انسان 'سابقون' میں سے بنے۔ قرآن مجید نے واضح الفاظ میں اس چیز کا مطالبہ کیا ہے کہ ہم نیکیوں کی طرف سبقت کریں۔ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: 'فاستبقوا الی الخیرات'، تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔ (۲:۱۴۸) نیکیوں کی طرف یہ سبقت دراصل خدا سے انعام و مغفرت پانے کی طرف سبقت ہے۔ سورۂ حدید میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے: 'سابقوا الی مغفرۃ ربکم' (۵۷:۲۱) اپنے رب کی بخشش کی طرف سبقت کرو۔ یہ دیکھیے کہ ان آیات میں کس طرح اس مزاج کو مخاطب کیا گیا ہے جو اسے 'عجول' ہونے کے لحاظ سے حاصل ہے۔ اور اس کی انتہا سورۂ واقعہ کی اس آیت میں ہے کہ 'السابقون السابقون' دنیا میں نیکیوں میں سبقت کرنے والے آخرت کے اجر میں بھی سبقت پانے والے ہوں گے۔

چنانچہ یہ عجلت پسندی بظاہر صبر کے الٹ ہے، مگر حقیقت میں یہ عین صبر کی مؤید ہے۔ یعنی آپ اگر ہر مرحلے میں دنیا کے لالچ میں جلد بازی کے بجائے، نیکی کی طرف بڑھنے کے لیے کوشاں ہوں تو یہ عین صبر کا تقاضا ہے، بلکہ صبر کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ آپ کو اپنے اندر کے اس جذبے کو مارنا نہیں ہے، بلکہ اس کا رخ بدلنا ہے۔ اسے دنیاداری سے ہٹا کر آخرت کا طالب بنانا ہے۔ اس گھوڑے کی لگامیں تھامیں رکھیں اور اسے نیکیوں کے راستے پر سرپٹ دوڑایے۔ اس لیے کہ ہمیں اسی کام کے لیے عجول بنایا گیا ہے۔ یعنی 'سابقوا الی مغفرۃ ربکم'۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ظلوم ہونا اور صبر

'ظلوم' کے معنی ظلم کرنے والے کے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ اپنے سادہ معنی ہی میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن سورۂ احزاب میں یہ جس سیاق وسباق میں آیا ہے اس سے اس کے اندر یہ معنی پیدا ہو گئے ہیں کہ انسان ذمہ اٹھانے میں حد سے بڑھ جانے والا ہے۔ سورۂ احزاب آیت ۷۲ میں یہ اس سیاق میں آیا ہے کہ انسان نے خدا کی امانت کا بار اٹھا لیا اور باقی تمام مخلوقات نے اس بار کو اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اس پر خدا نے یہ تبصرہ فرمایا کہ 'انہ کان ظلوما جھولا'۔ یعنی انسان ظلوم اور جذباتی ہے۔ یہاں اس نے ظلم صرف یہ کیا ہے کہ وہ جذبات میں آ کر اس بار امانت کو اٹھا بیٹھا۔ گویا اس سیاق وسباق میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان نے اپنی ہمت سے بڑھ کر بوجھ اٹھا لیا۔

انسان کی سرشت کی یہ خوبی ہے، جس نے اسے ستاروں پر کمند ڈالنے کا حوصلہ دیا ہے۔ جس کی بنا پر وہ بار بار گرنے کے بعد بھی اٹھ کر سنبھل سکتا ہے۔ یہی وہ داعیہ ہے جس کے بل پر نہایت قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود بدر وحنین میں اتر جاتا ہے۔ راہ عشق میں انسان کی ساری قربانیاں اور وطن وقوم کے لیے اپنی جان تک کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جانا اسی سرشت کی بنا پر ہے۔

انسان کو 'ظلوم' اس لیے بنایا گیا ہے کہ وہ حق وانصاف کی خاطر بدر واحد کے میدان میں اتر سکے۔ وہ عمرو بکر کی طرح اپنی قوم کی مخالفت مول لے سکے۔ بلال وحارث کی طرح حق کی خاطر ستایا جائے، اور پھر بھی وہ دین حق پر قائم رہنے کا اعلان کرتا رہے۔

انسان کی یہ سرشت اسے حق کی خاطر وہ ثبات قدم عطا کرتی ہے کہ وہ میدان بدر میں جام شہادت نوش کرتا ہے۔ اسے موت اپنے سامنے رقصاں نظر آتی ہے، مگر وہ ڈٹا رہتا ہے۔ انسان کی یہ صفت 'ظلوم' اس کا ایک اعلیٰ وصف ہے۔ جو حق کے لیے ہو تو بے مثال داستانیں رقم کرتا ہے اور اگر بے گناہ معصوم لوگوں کے خلاف ہو تو تاریخ انسانی کی خونچکاں تاریخ رقم کرتا ہے۔ اور وہ 'ظلوم' کی صلاحیت کا غلط استعمال کر کے ظالم بن جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ انسان راہ حق میں ثابت قدمی کے لیے جس وصف سے نوازا گیا تھا، وہ اسے ظلم وستم کی داستانیں رقم کرنے کے لیے صرف کرتا رہتا ہے۔ 'عجول' کی صفت کی طرح ہمیں اس سرشت کو بھی بس قابو کر کے راہ حق میں لگانا ہے۔ پھر یہ راہ حق میں ہمیں ایسا ثبات قدم عطا کرتی ہے کہ ہم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن سکتے ہیں۔

جہول ہونا اور صبر

'جہول' کے معنی جذباتی ہونے کے ہیں۔ انسان میں سے اگر جذبات نکال دیے جائیں تو وہ نامکمل ہو جاتا ہے۔ جہول

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کا یہ داعیہ کئی جذبات کو متحرک کرتا ہے۔ جیسے محبت وشفقت، غیرت وعصبیت، غیظ وغضب، نفرت وحقارت، تنفر وابا وغیرہ۔ یہ تمام جذبات انسان کے لیے قوت محرکہ کا کام کرتے ہیں۔ اگر یہ جذبات نہ ہوں تو انسان مٹی کے ڈھیر کی طرح ہو کر بیٹھ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام جذبات حق کے ساتھ دینے اور اس کے ساتھ چلنے کی قوت وتحریک کے لیے دیے تھے۔ مگر ہم انھیں غلط طریقے پر استعمال کرتے ہوئے محض اپنی ذات یا قوم قبیلے کے مفادات کے لیے خاص کر لیتے ہیں۔ بلاشبہ ان جذبات کے ظاہر ہونے کے مقامات میں ذات، قبیلہ اور قوم ووطن بھی ہیں، مگر یہاں انھیں حق کے تابع ہونا چاہیے۔ جب آدمی کے قدم جادۂ حق سے پھسلنے لگیں ان میں کمزوری آنے لگے تو اس وقت حق کے ساتھ ہمارے یہ جذبات ہمیں واپس لاتے ہیں۔ کبھی حق کی خاطر ہی یہ جذبات ہماری ذات کے لیے دائرۂ حق کے اندر رہتے ہوئے، ہمارے ساتھ خاص ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ذات یا قوم وقبیلہ کے ساتھ یہ جذبات حق کے دائرے میں رہتے ہوئے خاص ہو جائیں تو یہ بھی حق ہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہ جاہلیت ہے۔ لیکن اگر ذات کے مفادات کے ساتھ بھی ان کا تعلق بنے، اور وہ دائرۂ حق میں ہو تو اس صورت میں بھی یہ ہمارے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ مثلاً ہو سکتا ہے کسی موقع پر ہمارے لیے جادۂ حق پر قائم رہنا ممکن نہ ہو، مگر دوزخ کا خوف اور جنت کی طمع ہمیں اگر بچا لے تو یہ عین صبر اور ثابت قدمی ہے۔

یعنی اس سے یہ بات ہم پر واضح ہوئی کہ ہمارے سچے جذبات اگر حق شناس ہو جائیں تو ہمارے لیے صبر اختیار کرنے اور حق پر قائم رہنے کے لیے یہ جذبات معاون ہوتے ہیں۔ نہ صرف معاون ہوتے ہیں، بلکہ تحریک وانگیخت کا باعث ہوتے ہیں، جو منفعل طریقے سے ہمیں جادۂ حق پر رواں رکھنے سے بڑھ کر جوش وجذبے کے ساتھ گام زن رکھتے ہیں۔

قرآن مجید نے انذار وتبشیر کے ذریعے سے صحابہ کے انھی جذبات کو ایسے متوازن طریقے سے حق کے لیے بیدار کیا کہ ان میں سے بعض اپنی زندگی ہی میں جنت کے مستحق قرار پائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جب میدان جنگ میں ایک کافر نے تھوک دیا تو انھوں نے تلوار روک لی۔ اس لیے کہ اب انھیں اس پر ذاتی غصہ تھا۔ اب اس پر تلوار حق کی خاطر نہ اٹھتی۔ یہ ضبط اپنے جذبات کو دراصل راہ حق کی طرف موڑنے سے حاصل ہوا تھا۔

ضعیف ہونا اور صبر

انسان دراصل 'ضعیف' بنایا گیا ہے۔ اس کے جسم اور اس کی روح کے اندر ضعف رکھا گیا ہے تاکہ وہ خدا کے سامنے سرفگندگی ظاہر کرے۔ اور خدا کے آگے سجدہ ریز ہو جائے۔ اور جب بھی اس پر مشکل آئے تو کسی مضبوط سہارے کو تلاش کر کے خدا تک پہنچے۔ مگر اس انسانی سرشت نے بھی آزادی واختیار کی بنا پر غلط راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ کبھی تو انسان نے اپنی کمزوری کو اپنے 'ظلوم' ہونے کے زور پر دبا یا اور خدا بن بیٹھا اور انسانوں پر ظلم ڈھانے لگا۔ یہ ظلم اس نے اسی لیے ڈھائے کہ اس کی کمزوری ظاہر نہ ہو۔ اور کسی کو اسے روکنے کی جرات اور دم خم باقی نہ رہے۔ اور کبھی ایسا ہوا کہ انسان نے یہ کمزوری اپنے اوپر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس طرح طاری کر لی کہ وہ کہیں ظالموں کے آگے مظلوم بن گیا اور کبھی بتوں کے آگے جھک گیا۔ اگر حق کی خاطر اس کو توازن دیا جاتا تو ایسا ہی حسن اخلاق وجود میں آتا جیسا کہ ہم نے اوپر کے داعیات میں دیکھا کہ توازن کی وجہ سے پیدا ہوا۔

ضعف بلاشبہ ہماری ایک کمزوری ہے۔ مگر یہ کمزوری بھی ہماری طاقت ہے۔ جو ہر خوف اور اندیشہ کے وقت ہمیں حق کی جانب دھکیل کر خدا کے آگے ڈال دیتی ہے۔ ہمارے مذہبی گروہوں میں سے ایک گروہ ایسا رہا ہے کہ انھیں اپنی اس سرشت کے اقرار میں مشکل رہی ہے اور وہ ہمیشہ خدا بننے کی کوشش میں فلسفہ سازیوں میں مگن رہے ہیں۔ اس چیز نے ہمارے مذہبی لوگوں میں کمزوری کو ایک منفی وصف بنا دیا ہے۔ حالانکہ یہ وصف منفی ہونے کے باوجود ایک مثبت وصف ہے کہ ہمیں اس حق شناسی پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ جو سیدنا موسیٰ کے منہ سے اس وقت ان الفاظ میں صادر ہوتا ہے جب وہ مصر سے فرار ہونے کے بعد مدین کی سرحد پر کھڑے یہ کہہ رہے تھے کہ اے اللہ اب تو مجھے جو بھی دے میں اس وقت اس کے لیے فقیر و محتاج ہوں۔ یہ شعور ذات اگر خدا کے مقابلے میں ہمیشہ کے لیے آدمی کو حاصل ہو جائے تو ایک ایسا طاقت ور انسان بن جاتا ہے کہ وہ خدا کی سرزمین میں خدا کے سہاروں کا سب سے بڑا مہبط ہوتا۔ اور اسی کی بنا پر وہ اپنی کمزوری کے باوجود مالک و حنبل کی طرح بادشاہوں کے مظالم کے آگے ایک پہاڑ بن جاتا اور بلال حبشی کی طرح صبر کا ایک اعلیٰ نمونہ بن جاتا ہے۔

اس اعتبار سے اگر ہم دیکھیں تو ضعف کا یہ داعیہ جو بظاہر صبر کے الٹ دکھائی دیتا ہے، وہ دراصل صبر کا سب سے زیادہ موثر مؤید و معاون ہے۔ یہ ہمارے اندر اس کی جستجو پیدا کرتا ہے کہ ہم دنیا میں سب سے زیادہ مضبوط سہارے کے ساتھ جڑ کر رہیں۔ اور یہ سب سے مضبوط سہارا اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات ہے۔ اور یہ سادہ عقلی اصول ہے کہ ہم جس کے سہارے کو حاصل کرنا چاہیں، اس کی محبت کو جیتنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ خدا کی محبت جیتنے کے لیے ہمیں حق پرستی کو اختیار کرنا ہوگا۔ اور ہم یہ جان چکے ہیں کہ یہی چیز صبر ہے۔

قتور ہونا اور صبر

'قتور' کے معنی تنگ دلی و بخل کے ہیں۔ یہ ہمارے اندر حصانت، احتیاط، اتقا اور تحفظات کو وجود بخشتا ہے۔ جب یہ تحفظات انسان پر زیادہ سوار ہو جائیں تو جس طرح بخیل بن کر مذموم ٹھہرتا ہے اسی طرح دوسرے امور میں حق پرستی سے دور رہتا ہے۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب یہود ایمان نہیں لا پا رہے تھے، تو اس کی وجہ قرآن سے یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اس مشیخت کو تحفظ دینا چاہتے ہیں، جو انھیں اہل کتاب ہونے کے ناتے حاصل تھی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے بظاہر ہاتھ سے جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ان پر تنقید کرتا ہے کہ تم حقیر قیمت کے عوض اس ہدایت کو نہ بیچو۔ میری آیات کا انکار محض اس وجہ سے نہ کرو کہ تم دنیا میں اس چند روزہ مشیخت کو باقی رکھو۔

اسی طرح ان کا یہ تحفظ بھی تھا کہ انبیا تو بنی اسرائیل میں آتے رہے ہیں۔ اب بھی یہ انھی کا حق ہے بھلا اب یہ نبی بنی اسماعیل

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میں کیوں کر آ گیا۔اس سے انھیں اپنی برتری جاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی جوان کے لیے ایمان لانے میں رکاوٹ بنی۔ جسے قرآن نے' حسدا من عند انفسهم '(ان کے اپنے حسد) کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔ان کے انھی تحفظات میں سے ایک پر قرآن نے اس طرح بھی چوٹ لگائی ہے کہ' اخشونی و لا تخشوا الناس '(مجھ سے ڈرو لوگوں سے نہ ڈرو)۔

یہ داعیہ بھی دراصل ان چیزوں کے روکنے کے لیے تھا، جنھیں اپنے پاس روکے رکھنا حق کا تقاضا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ داعیہ اس لیے رکھا ہے کہ ہم اپنے ہاتھ سے خیر کو نہ جانے دیں۔ خیر کو ہاتھ سے جاتے دیکھ کر ہمارے اندر ویسا ہی احساس محرومی پیدا ہو، جیسا مال کو جاتے دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے اندر یہ بخل ہونا چاہیے کہ ہم ایک ایک نیکی کو سینت سینت کر رکھیں۔ ایک بخیل آدمی کی طرح جو اپنے مال کو سنبھال کر رکھتا ہے، ہم اپنی فطرت اور اپنے اندر کی نیکیوں کو ضائع ہونے سے بچائیں۔ ہمہ وقت اس کوشش میں رہیں کہ ہمارا ایمان کہیں شیطان کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔اور وہ ہماری راہ کھوٹی نہ کر دے۔

جو آدمی اپنے پاس موجود نیکی کو ضائع نہ ہونے دے گا وہ دراصل نیکی پر قائم ہے۔ وہ نہ ریاکاری کرے گا اور نہ معاشرے اور ماحول کی دیکھا دیکھی نیکی کو چھوڑ کر برائی کو اختیار کرے گا، اور نہ محض متاع دنیا کے عوض کبھی گمراہی خریدے گا، بلکہ وہ اس کے اگر تحفظات ہوں، تو وہ یہ ہوں گے کہ کہیں یہ کرنے سے میرا ایمان تو رخصت نہیں ہو جائے گا۔کہیں ناانصافی تو نہیں کر بیٹھوں گا اور کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میرے اور معاشرے کے اندر سے میرے اس عمل سے نیکی ختم ہو جائے گی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہلوع ہونا اور صبر

'ھلوع' کے معنی تھڑدلے کے ہیں۔یعنی ذرا سی مصیبت پر ہی جزع فزع کرنے والا۔اہل لغت نے اس کے معنی حریص اور بزدل کے بھی بتائے ہیں۔قرآن میں یہ اس سیاق میں آیا ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا. اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا. وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا. (المعارج ۷۰: ۱۹۔۲۱)	''بلاشبہ انسان تھڑدلا بنا ہے جب اسے برائی لاحق ہوتی ہے، تو وہ جزع فزع کرتا ہے۔ اور جب اسے بھلائی نصیب ہوتی ہے تو وہ بخیل بن جاتا ہے۔''

یہ بھی پچھلے پانچوں داعیات کی طرح بظاہر صبر کے مقابل و حریف کی طرح نظر آتا ہے۔مگر یہ بھی دراصل اسی مثبت داعیے کا منفی رخ ہے اس کا دوسرا رخ مثبت بھی ہے۔یعنی یہ انسان کو بے چینیوں میں مبتلا کر کے اصلاح احوال کی طرف دھکیلتا ہے۔ قرآن میں یہ اپنے منفی پہلو ہی سے بیان ہوا ہے، لیکن ہم یہ جان چکے ہیں کہ تمام داعیات اپنے ایجابی و سلبی دونوں رخ رکھتے ہیں۔ ہلوع کی بزدلی ہمارے لیے خدا کی طرف بڑھنے کا پیش خیمہ ہے۔ یہ بزدلی خدا کے آگے آہ وزاری کا سبب ہے۔ہمیں سرکشی سے روکتی ہے۔ ہلوع میں حرص کا پہلو ہمیں نیکیوں کا حریص بناتا ہے۔ ہم اجر کے حریص بنتے ہیں۔اس کے اندر بخیل کا پہلو ہمیں نیکیوں اور اخلاق کی خوبیوں کی حفاظت پر ابھارتا ہے۔مگر یہ الگ بات ہے کہ ہم اکثر اس داعیے کو غلط

استعمال کرتے ہیں۔

خلاصہ

اس باب میں ہم نے چند اہم داعیات کو اس مختصر سی وضاحت سے سمجھا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں صبر کی آزمایش میں ڈال کر اس کے ساتھ کچھ داعیات کو بھی ہمارے اندر رکھ دیا ہے۔ جو حق کے ساتھ ہمارے بندھن کو مضبوط کرتے اور اس کے ساتھ ہمارے تعلق کو دوام بخشتے ہیں۔ ان داعیات کو صحیح رخ پر ڈال کر ہم اپنے اندر صبر کی صفت کو پیدا کر سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں 'عجول، ظلوم، جھول، ضعیف، قتور' اور 'ھلوع' اس لیے بنایا ہے کہ ہم اپنے ان اوصاف کی بنا پر حق پر ثابت قدم رہ سکیں۔ اور یہ داعیات ہمیں راہ حق پر قائم رکھنے کے لیے کبھی جذبۂ سبقت، کبھی ہمت، کبھی جوش و حمیت، کبھی، احتیاط و تحفظات، ٹھہراؤ اور بے چینی کے جذبے عطا کر کے ہمیں راہ حق پر قائم رکھتے ہیں، مگر یہ بات ہم اپنی تاریخ انسانی میں بھی اور اپنی زندگیوں میں دیکھتے ہیں کہ انھی جذبات کی تسکین ہمیں راہ حق سے ہٹا بھی دیتی ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم ان پر نگاہ رکھیں اور ان داعیات کا استعمال نہایت سوچ سمجھ کر کریں۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com